پاکستان:

معاشی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات

ندیم الحق
(عبدالصمد)

ترجمہ
طاہر کامران

پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس
اسلام آباد

پاکستان:
معاشی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات

ندیم الحق
(عبدالصمد)

ترجمہ
طاہر کامران

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس
اسلام آباد

This is an authorized Urdu Translation of
GOVERNANCE, ECONOMIC POLICY
AND REFORM IN PAKISTAN:
Essays in Policical Economy
by: Nadeem Ul Haque, (Abdus Samad)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	=	پاکستان: معاشی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات
مصنف	=	ندیم الحق (عبدالصمد)
مترجم	=	طاہر کامران
پبلشرز	=	پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس اسلام آباد فون: 9248137
پرنٹرز	=	یونی بز، اسلام آباد
اشاعت	=	1996ء اور 2021ء

فہرست مندرجات

	تعارف ڈاکٹر مبارک علی	iii
	(الف) حکومت پر انحصار	
	I. دانشور و ماہرین تعلیم کا حکومت پر انحصار	
1	گمبھیر مسئلہ: ہماری زوال پذیر اقدار	1
2	ویسٹ منسٹر کی پیروی	7
3	اکیڈمکس: ان کی فطرت، کردار اور اہمیت	13
4	ڈونر فنڈنگ اور پاکستان میں تحقیق کے میدان میں ترقی کے امکانات	19
5	چٹکلے چلتے ہیں	27
	II. ماہرین معیشت، معاشی پالیسی اور حکومت پر انحصار	33
6	نئے ڈاکٹر	35
7	حکومت اور فراہمی روزگار	41
8	تعلیم پر حکومتی اخراجات اور تعلیم کی حالت زار	45
9	حکومت اور اشتہارات	49
10	حکومت شریک کار یا لٹیری	57
11	حکومت پاکستان: لغزشوں کا ایک تماشہ	63
12	حکومتی ادارے یا جاگیریں	67
	III. پریس اور حکومتی کردار	73
13	صحافت! ایک تجزیہ	75
14	سوالات! جو کہ صحافیوں کو پوچھنے چاہیں!	79
15	چند تارکین وطن پاکستانیوں سے گفتگو!	85
	(ب) سماجی اور سیاسی مضامین	91
16	کیا تمام تارکین وطن نے پاکستان کو خیر باد کہہ دیا؟	93
17	شعبہ میڈیکل میں بداعمالیاں	97
18	وقار، عزت، غیرت اور منافقت	101

19	طبقہ اعلیٰ اور غیر سرکاری تنظیمیں	107
20	میں نے جلاوطنی کیونکر اختیار کی؟	113
21	نیشنلزم پر نظر ثانی	119
	(ج) معاشیات اور معاشی پالیسی پر مضامین	123
22	تارک الوطن پاکستانی معاشیات دانوں سے مکالمہ!	125
23	ایک کاروباری ماہر کا نقطہ نظر	133
24	معاشیات اور معاشی پالیسی: ایک تجزیہ	143
25	حکومتی قرضے کے مضمرات	153
26	کرایہ طلبی کے بڑھتے ہوئے رجحانات	161
27	کچھ قیمت کے متعلق	167
	(د) اصلاح کے لئے امکانات	171
28	اصلاحات پر ایک معلوماتی مباحثے کی ضرورت: حالات کی ابتری کا جائزہ	173
29	کابینہ کے حجم کو کم کرو!	183
30	جمہوریت کی مضبوط بنیادیں	187
31	اہل حکومت کی ذمہ داریاں	193
32	پاکستان کی تاریخ میں سول سروس کا کردار	199
33	انسانی سرمایہ اور حکومت کی اصلاح	205
34	یونیورسٹی کی اصلاح کے لئے ایک تجویز!	211
35	آیئے زراعت کو عقلی بنیادوں پر استوار کریں!	215
36	سول سروس کی اصلاح	219
37	ماہر سیاسیات کے ساتھ ایک مذاکرہ	223

تعارف

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر عبدالصمد کا کیس پاکستان کے تناظر میں کوئی نیا نہیں ہے۔ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے بعد وہ پاکستان واپس آئے تاکہ یہاں کسی یونیورسٹی میں ملازمت کر کے جو کچھ انہوں نے باہر رہ کر سیکھا ہے اس سے نوجوان طالب علموں کو آگاہ کر سکیں۔ مگر پاکستان کی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ملازمت حاصل کرنے کے اصول وقوانین بدل گئے ہیں۔ اس لئے ملازمت کے لئے تعلیمی قابلیت سے زیادہ سفارش اور کسی اعلیٰ عہدے دار یا سیاستدان کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں ملازمت کے مواقع نہ پا کر ڈاکٹر عبدالصمد واپس امریکہ چلے گئے اور اب وہ کینیڈا اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں۔

اگرچہ ڈاکٹر عبدالصمد نے جلاوطنی تو اختیار کر لی، مگر پاکستان سے ان کا تعلق نہ تو ٹوٹا اور نہ ختم ہوا۔ وہ وقتاً فوقتاً پاکستان پر انگریزی میں مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے یہ مضامین پاکستان کے انگریزی اخباروں اور رسالوں میں چھپتے رہے۔ انہیں مضامین کا مجموعہ 1994ء میں لاہور سے چھپا۔ ڈاکٹر عبدالصمد کا خیال تھا کہ ان مضامین میں جو مباحث اٹھائے گئے ہیں۔ ان پر پاکستان کے دانشوروں میں بحث ومباحثہ ہوگا، اور یہ بحث ومباحثہ علمی وادبی فضا کو پیدا کرے گا۔ مگر ان کو اس پر مایوسی ہوئی کہ ان کی تحریروں پر نہ تو کسی نے بحث کی، اور نہ تبصرہ۔

شاید ملک سے ایک طویل عرصہ تک باہر رہنے کی وجہ سے ڈاکٹر عبدالصمد کو اس بات کا اندازہ نہیں رہا کہ پاکستان جس دوقومی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا، اب اس نے مذہبی کی جگہ ثقافتی شکل اختیار کر لی ہے اب یہ دوقومیں انگریزی بولنے والے طبقہ اعلیٰ اردو اور صوبائی زبانیں بولنے والے پس ماندہ لوگوں میں بٹ گئی ہیں۔ یہ دو دنیائیں ہیں کہ جو ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ چارلس ڈکنز نے جو ''دو شہروں کی کہانی'' لکھی تھی، ہم اس کا منظر بن گئے ہیں۔ انگریزی بولنے والے، اردو اور مقامی زبانوں سے واقف نہیں، اردو و مقامی زبانیں بولنے والوں کی خواہش ہے کہ وہ بھی انگریزی میں مہارت حاصل کریں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں میں لکھی جانے والی کتابیں اپنے اپنے سرکلز میں محدود رہتی ہیں۔

انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو فائدہ یہ ہے کہ انہیں اس زبان میں ہر موضوع پر کتابیں مل جاتی

ہیں۔اردو جاننے والوں کو اپنے ہی لکھنے والوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔یا ان بیکار اور مسخ ترجموں پر کہ جو کبھی کبھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔اس لئے اردو زبان میں علمی موضوعات کی بے انتہا کمی ہے۔اس میں یا تو مذہبی کتابیں چھپتی ہیں۔یا شعر و شاعری اور افسانے۔

ایک مفکر سوروئے کن تھا۔اس نے قوموں کی تاریخ کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہی تھی کہ تہذیب کے ابتدائی دور میں ان کا رجحان عقائد اور شاعری کی طرف ہوتا ہے اور جب تک کوئی قوم شعر سے نثر کی طرف نہیں آئے گی۔اس وقت تک اس میں فکر اور سائنسی سوچ پیدا نہیں ہوگی۔اس لئے یہ ایک اہم سوال ہے کہ کیا ہم اب تک ابتدائی دور میں ہی ہیں؟ کیونکہ عقیدہ کی جکڑ، اور شاعری کی جذباتیت انسانی ذہن کو آزاد نہیں ہونے دیتی ہے پاکستانی معاشرہ کے لئے یہ بحث طلب مسئلہ ہے کہ اسے کیسے حل کیا جائے؟

پاکستانی معاشرے کو ایک تاریخی ورثہ جو ملا ہے، وہ ''سرکار'' کا تصور ہے۔کیا سرکار مائی باپ ہے؟ کیا ہر کام کے لئے اس پر بھروسہ کرنا چاہئے؟ یہ تصور شخصی نظام حکومت اور پھر نو آبادیاتی دور میں کامیاب رہا۔سرکار پر مکمل انحصار ''بھروسہ'' اور سرکار کی ''سرپرستی'' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں میں اپنے پر اعتماد نہیں رہا۔جیسے جیسے سرکار بدعنوان اور نااہل ہوتی چلی گئی۔اس طرح سے عوام و فرد اپنے آپ کو بے سہارا، اور مجبور محسوس کرتے چلے گئے۔شخصی دور میں تو سرکار کے بنانے اور بگاڑنے میں عوام کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا تھا۔مگر ہمارے جمہوری طرز حکومت میں بھی سرکار اوپر ہی سے بنتی ہے، اور عوام اس کی تشکیل سے دور رہتے ہیں۔اگر آمرانہ حکومتیں نہ ہو، اور نام نہاد جمہوریت ہو، تو تب بھی حکمران طبقے کے لوگ عوام کے پاس صرف ووٹ لینے جاتے ہیں۔اس کے بعد عوام کا فرض پورا ہو جاتا ہے۔اور یہ جمہوری حکومتیں، اپنی آمرانہ پالیسیوں کو ان پر نافذ کرتی رہتی ہیں۔کیا ایسی کوئی صورت ہے کہ اس نظام کو تبدیل کیا جائے۔اور عوام کو ووٹ سے زیادہ سیاسی عمل میں شریک کیا جائے؟

حکومتوں کی نااہلی کو دیکھتے ہوئے، ترقی یافتہ ملکوں نے ایک نئی سکیم شروع کی اور وہ یہ کہ غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعہ عوامی فلاح و بہبود اور سماجی بھلائی کے لئے کام کیا جائے۔یہ پاکستان میں ''این جی اوز'' کا سلسلہ ہے کہ جس نے آن واحد میں پورے معاشرے کی سرگرمیوں کو اپنی زد میں لے لیا۔غیر سرکاری تنظیموں کا یہ رواج نیا نہیں ہے۔بلکہ اس سے پہلے بھی فلاح و بہبود اور تعلیمی ترقی کے لئے اس قسم کی انجمنیں اور تنظیمیں بنتی رہتی تھی۔مگر ان دونوں میں جو فرق ہے وہ یہ کہ

ہماری روایتی فلاحی انجمنوں کا دارومدار لوگوں کے چندوں اور مالی امداد پر ہوتا تھا لیکن اب این جی اوز کو اپنے لوگوں کے چندوں سے غرض نہیں، بلکہ یہ غیر ملکی امداد پر بھروسہ کرتی ہیں۔ اس وجہ سے دونوں کے اغراض و مقاصد میں فرق ہو گیا ہے۔ اب این جی اوز میں سماجی کارکنوں کی جگہ تنخواہ دار پیشہ ور اہل علم ہیں۔ این۔ جی۔ اوز میں کام کرنا ان کے لئے خدمت نہیں، بلکہ ملازمت ہے۔ اس وجہ سے یہ این۔ جی۔ اوز ہمارے معاشرے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لاسکیں۔ اس لئے پھر یہ سوال آتا ہے کہ ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔؟

ہم سب اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان میں تعلیمی ادارے ختم ہو چکے ہیں۔ جب سرکاری تعلیمی ادارے ختم ہوئے تو ان کی جگہ نجی اداروں نے لینا شروع کر دی۔ جب ہماری یونیورسٹوں کی ڈگریوں کی کوئی عزت نہیں رہی یا ان کی قدر و قیمت ختم ہو گئی۔ تو غیر ملکی یونیورسٹیوں نے ہمارے ہاں تجارت شروع کر دی۔ اب امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، اور آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں کے بازار لگتے ہیں۔ کیا یہ سلسلہ ہمارے تعلیمی خلا کو پورا کر سکے گا اور ہم کوئی ایسا دانشوروں کا طبقہ پیدا کر سکیں گے کہ جو ہمارے مسائل کا تجزیہ کر سکے؟

کسی بھی ملک کے قوم یا معاشرے میں تبدیلی کے تین ذریعے ہوتے ہیں۔ اور ان تینوں کو ساتھ ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ دانشور، جو کہ لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیلی کے لئے آمادہ کریں اور نئے نظریات و افکار سے انہیں روشناس کرائیں۔ سماجی تحریکیں، جو لوگوں میں جا کر کام کر سکیں اور ان کے رابطہ میں آ کر سماجی مسائل سے واقف ہوں، پھر سیاسی تحریکیں، جو نظام کو لوگوں کے مفادات کے تحت تبدیل کریں۔ اس موقع پر پھر یہ سوال آتا ہے کہ کیا پاکستان میں یہ تینوں تحریکیں ہیں؟ اور اگر ہیں تو کیا ان میں کوئی رابطہ اور ہم آہنگی ہے؟

ڈاکٹر عبدالصمد نے اس کتاب میں ایسے ہی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ ان مسائل پر بحث کی جائے اور فکر کے نئے در کھولے جائیں۔ انگریزی داں طبقے سے مایوس ہو کر، انہوں نے اس کا اردو ترجمہ کر دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اردو داں طبقہ بھی انہیں اسی طرح سے مایوس کرے گا جیسے کہ انگریزی داں طبقہ نے کیا؟

(الف) حکومت پر انحصار

1۔ دانشور و ماہرین تعلیم کا حکومت پر انحصار

(1)

گمبھیر مسئلہ: ہماری زوال پذیر اقدار

عمومی طور پر ہمیں درپیش سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کی وجہ ہماری زوال پذیر اقدار کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر اقبال احمد روزنامہ ڈان میں 20 ستمبر 1992ء کو شائع ہونے والے مضمون میں رقم طراز ہیں ''ہماری سیاسی زندگی میں جمہوری اور غیر جمہوری قوتوں کے درمیان جنم لینے والے عدم توازن کے پیچھے روایت اور اقدار ہی کا سوال پنہاں ہے'' اس بیان کے ساتھ اتفاق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل کسی کے لئے بھی اس طرح کی سوچ سے اختلاف کرنا بہت مشکل ہے غالباً یہ استدلال (اقدار و روایات کا زوال) ہر جگہ اور ہر ٹی ہاؤس میں بکثرت سننے کو ملتا ہے اور ہر طرح کے مذہبی رجعت پسند اسے اپنے مخصوص فرقے کو مقبول بنانے کے لئے ابتدائیہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اس انداز فکر یعنی اپنی اقدار ہی کو مورد الزام ٹھہرانے کا فائدہ یہ ہے کہ ہمیں نہ صرف ایک بنا بنایا تجزیہ میسر آ جاتا ہے بلکہ بہت ہی آسان جواب بھی یعنی ''اپنی اقدار کو ٹھیک کرنا چاہئے'' بعد ازاں ہماری خواہش ہوتی ہے کہ موجودہ اقدار میں تبدیلی آ جائے پھر ہم یہ امید کرنے لگتے ہیں کہ کسی دن پاکستان میں ایک با اخلاق، دیانت دار، اور محنتی شخص ظہور پذیر ہوگا اور تمام مسائل کو حل کر دے گا۔

ایک اور بات جو اس طرح کے عالم فاضل حضرات شاید ہمیں بتانا پسند کریں کہ ہمارے ہاں رائج اقدار کو ناپنے کے لئے وہ کونسا پیمائشی آلہ استعمال کرنا پسند کریں گے۔ کیا ان کے پاس اقدار کی ناپ تول کے لئے کوئی بین الاقوامی معیار موجود ہے جس کے ذریعے وہ مختلف ممالک کی ان اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے درجہ بندی کر سکیں؟ اگر ایسا ہے تو میں یہ جاننے میں دلچسپی رکھتا ہوں کہ کیا ہم جرمنوں سے زیادہ لالچی اہل تنزانیہ سے بھی زیادہ سست اور اہل ارجنٹائن سے بھی زیادہ بداخلاق

ہیں؟اور کیا ہم روسیوں سے بھی زیادہ خودغرض ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر اقبال احمد لکھتے ہیں کہ ''کسی بھی سماجی اور سیاسی نظام کی نمواور استحکام کے لئے اقدار مرکزی کردار ادا کرتی ہیں اور جب یہ تار تار ہو جاتی ہیں تو سماج وحکومت بحرانی کیفیت سے بری طرح دوچار ہو جاتی ہیں'' اور کیا درج ذیل دو بظاہر مختلف نوعیت کے بیانات کو ایک ہی جیسا قرار نہیں دیا جا سکتا۔(الف) ایک معاشرہ اس لئے زوال سے دوچار ہوتا ہے کیونکہ اس کے اخلاقی معیار گر جاتے ہیں۔(ب) اقدار اور اخلاقیات کے معیار اس لئے گر رہے ہیں کیونکہ معاشرے میں زوال کی ابتدا ہو چکی ہے۔شاید ہر وہ معاشرہ جو تبدیلی کی حالت میں ہو یا دیگر مشکلات میں گھرا ہوا ہو وہاں اقدار اور اخلاقی معیارات کی تبدیلی کوئی اچھنبے کی بات نہیں نتیجتاً یہ کہنا کہ ایسے معاشرے کی اقدار اچھی نہیں کچھ اور نہیں بلکہ سچ ہے۔

ہماری اخلاقی گراوٹ کی وجوہات

بدقسمتی سے جب بھی تجزیہ کیا جا سکتا ہے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اقدار زوال پذیر ہیں لیکن ان علماء وفضلا میں سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اقدار میں در آنے والے زوال کی وجوہات کا تعین کرنے کی کوشش کریں میری نظر میں یہ وجوہات درج ذیل ہیں۔

(ا) دانشورانہ کوشش اور اخلاقی گراوٹ:

غالباً غیر حقیقت پسندانہ تجزیات اور شخصیت پرستی سے آئی ہوئی دانشورانہ فضا نے اخلاقیات میں زوال پذیری کے عمل کو تیز تر کر دیا ہے مثال کے طور پر ایسی صورتحال پر ہمیں غور کرنا چاہئے جس میں فکر کے رہنما (دانشور) کاہل ہوں اور وہ زیادہ تر اپنے پٹھوں پر اعتماد کرتے ہوں علاوہ ازیں جہاں فکر اور تحقیق کی بجائے زبان کی خوبصورتی پر زیادہ دھیان دیا جائے اس پر مستزاد یہ کہ قارئین کی قلیل تعداد اور وہ بھی جدید معلومات سے بہت حد تک عاری جو شخصی وابستیوں میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے۔جب عملی وفکری ماحول اس طرح کا ہو تو بحث وتمحیص کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور بجائے اس کے کہ بات کی تہہ میں موجود فکر اور اس کی ماہیت پر غور کیا جائے اس شخص پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے جس نے یہ بات کہی ہوتی ہے۔اس طرح ہم دانشورانہ دیانت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جو کہ بہت اہم قدر یا نیکی ہوتی ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ برصغیر کے مسلمان بین الاقوامی معیار کے معدودے چند دانشور اور ماہرین تعلیم ہی پیدا کر سکے ہیں گو کہ اس حقیقت پر تاریخ کے ماہرین بہتر انداز میں روشنی ڈال سکیں گے لیکن ہم نہایت ہی وثوق کے ساتھ یہ نتیجہ آخذ کر سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں علمی فکر کی گہرائی اس وجہ سے پیدا نہیں ہوسکی کیونکہ یہاں فکر ودانش کے حامل افراد کی شدید کمی رہی ہے۔اس طرح کے غیر سنجیدہ علمی وفکری ماحول میں صحافیوں، تعلیم کے ماہرین اور سیاسی کارکنوں کے درمیان فرق روا رکھنے کا تکلف برتنا بھی مناسب خیال نہیں کیا جاتا علمی وفکری مباحث کو خالصتاً ٹی ہاؤس کی ریت وروایت کے مطابق ڈھال دیا گیا ہے جن میں دلیل کے زور پر دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے چنانچہ مانا ہوا دانشور وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ اونچا بول سکے۔ بے جا فصاحت و بلاغت کا استعمال کر کے دوسروں کو مرعوب کر سکے اور دوسرے کی بے عزتی کرنے میں تیزی کا مظاہرہ کر سکے۔محتاط انداز میں مطالعہ ومشاہدہ، تحقیق اور حقائق پر توجہ دینے کی بجائے محض لفاظی یا اشعار کا بھی بے جا استعمال کر کے دلیل کو بے اثر کر دیا جاتا ہے اور حاضرین بھی اس عمل سے متاثر ہوکر بہت فیاضی سے داد دینے لگتے ہیں۔

علمی وفکری کھوکھلے پن کے ساتھ ساتھ جب ہم اپنے لیڈروں کی ضرورت سے زیادہ تکریم ومنزلت کرنے لگتے ہیں تو زوال کا عمل تیز تر ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح ایک صحافی یا سیاسی کارکن اخبار میں چند مضامین لکھنے کے بعد اپنے آپ کو بہت اہم تصور کرنے لگتا ہے تب وہ اس ملک میں موجود اپنے جیسی سوچ کے حامل لوگوں سے رابطہ استوار کر لیتا ہے اس کے بعد وہ جو کچھ بھی کہے چاہے وہ بہت ہی عامیانہ قسم کی بات ہی کیوں نہ ہو اس کی ہر طرف سے پذیرائی ہونا شروع ہو جاتی ہے البتہ یہ حضرت اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ جو بھی بات کہی جائے خوبصورت الفاظ و اصلاحات کا سہارا لے کر کہی جائے۔مثال کے طور پر ہمیں مسئلہ کشمیر پر نئی حکمت عملیوں کے نام پر ایک ہی بات بار بار سننی پڑتی ہے یا افغانستان سے متعلق آئی ایس آئی کی نئی پالیسی کیا ہے۔حالانکہ اس نئی پالیسی میں قطعاً کوئی نیا پن نہیں ہوتا یا گزشتہ رات خارجہ پالیسی میں کی جانے والی تبدیلی جس میں دراصل کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی یا آج صبح نیوکلیئر حکمت عملی میں نئی پیش رفت بھی بالکل ایسی ہی مثال ہے اور آخر میں یہ گھسی پٹی بحث بھی ان دانشوروں کا پسندیدہ موضوع ہے کہ لوگوں میں طبقاتی نفرت کے بارے میں وہ کیا سوچتے ہیں یا یہ کہ اقدار میں انحطاط ہی زوال کی اصل وجہ ہے اس کی پرواہ کئے بغیر کہ کہی جانے والی بات میں کوئی دم خم ہے یا نہیں یا یہ مصدقہ ذرائع پر مبنی ہے یا اڑتی

پھرتی افواہ کہ جس میں کوئی دلچسپ بات کہی گئی ہے یا مسائل کا وضاحت سے کوئی جواب دیا گیا ہے یا نہیں سامعین داد دینے میں کسی قسم کے لیت ولعل سے کام نہیں لیتے۔

بحث ومباحثہ اور متبادل فکر وخیال کو کئی طریقوں سے دبا دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال احمد کے مطابق ہمارے سیاسی ماحول وایوان حکومت میں قوت برداشت کا بہت فقدان ہے میں اس بیان سے کلیتہً اتفاق کرتا ہوں لیکن میں اسے آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی کہوں گا کہ ہمارے ہاں فکر ودانش پر بھی قدغنیں عائد کردی گئی ہیں کیونکہ اعلیٰ طبقے کے دانشور بھی نئی سوچ یا فکر کے بارے میں تشدد آمیز رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ عمل ہر حلقہ ہائے دانش کا طرہ امتیاز ہے خواہ وہ حلقہ بائیں بازو والوں کا ہو آزاد سوچ رکھنے والوں کا ہو یا معتدل خیالات والوں کا، مذہبی یا سیکولر نقطہ نظر کے حامل لوگوں کا ہو، طبقہ اعلیٰ کے دانشور اپنے حواریوں کے ہمراہ نئی سوچ یا خیالات مفروضوں یا نظریات پر بری طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور اس کی پوری شدومد کے ساتھ مذمت کی جاتی ہے ان نام نہاد دانشوروں کی پسندیدہ اصطلاحات چند ایک ہی ہیں جو وہ ہر طرح کی گفتگو میں بہت ہی تواتر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں مثلاً بورژوا، فارن، امریکن، نیرو، اپر کلاس، ویو پوائنٹ (طبقہ اعلیٰ کی تنگ نظر سوچ) وغیرہ۔ جب ان اصطلاحات سے بھی بات نہیں بنتی دکھائی دیتی تو یہ حضرات ذاتی حملوں پر اتر آتے ہیں اگر اس طرح کے حملے کرنے والے دانشوروں کے حواری جو عموماً ایسی قبیح حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پوری طرح سے تیار رہتے ہیں کہ جب ان کا آقا ذاتیات پر اترے اور وہ شور مچا مچا کر اسے داد وتحسین سے نوازیں ایسی صورت حال اس دانشور کے لئے نہایت باعث اطمینان ہوتی ہے۔ اس حالت میں نئے ابھر کر آنے والے دانشوروں کو ان کا نقطہ نظر سنے بغیر اور اس پر کسی قسم کا غور وفکر کئے بغیر ہی رد کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ کافی ہاؤس سے اپنے سفر کا آغاز کر کے گلڈ کے پورے ممبر نہیں بنے۔

(ب) حکومتی کردار

اگر کسی کو اس مسئلے پر مزید غور وفکر کرنے میں دلچسپی ہو تو ایک اور ممکنہ مفروضہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے دیوقامت دانشوروں نے خواہ ان کا تعلق دائیں بازو سے ہو یا بائیں بازو سے انہوں نے ہمیشہ یہ موقف اختیار کئے رکھا ہے کہ لوگوں کو کچھ پتہ نہیں کہ ان کے لئے کیا بہتر ہے نتیجتاً ہماری زندگیوں سے متعلق ہر قسم کا فیصلہ وہ ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً معتدل مزاج اور قدامت پسند

دانشور اس خیال کے زبردست حامی ہیں کہ ہمارے بچوں کو مغربی تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہئے ان میں سے ہر ایک یہی کہتا ہے کہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ پاکستانی معاشرے سے کیا چیز مطابقت رکھتی ہے اور کیا نہیں۔ مذکورہ بالا ہر دو طرح کے دانشور حکومت کے ذریعے ایک مخصوص تعلیمی نظام عوام پر ٹھونسنے کے حامی ہیں جب کہ دوسری طرف ہم اس رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اپنی جائیداد اور سرمائے کا بیشتر حصہ خرچ کر کے اپنے بچوں کو مغربی تعلیم کے حصول کے لئے یورپ یا امریکہ بھیجتے ہیں۔ اس طرح ہمیں مجبور کر دیا جاتا ہے کہ غیر معقول طریقے اختیار کر کے اس عائد کردہ پابندی سے نکل بھاگیں۔

عام آدمی کی سوچ سے قطعی طور پر مختلف قسم کے دلائل دے کر ان دانشوروں نے ہماری زندگیوں پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول حاصل کر لیا ہے اور اس کنٹرول کو مزید مستحکم بنانے کے لئے وہ حکومتی کردار میں زیادہ سے زیادہ اضافے کے حق میں دلائل دیتے ہیں اس صدی کی چھٹی دہائی کے دوران ہر طرح کی پلاننگ درآمدی منصوبہ بندی اور ایکسچینج کنٹرول سے متعلق یہی حضرات ہمیں ترغیبات دیتے رہے کہ ہمیں کیا خرچ کرنا ہے اور ہمیں کہاں سرمایہ کاری کرنا ہے۔ وہ محدود سی آزادی جو ہمیں میسر تھی انہیں وہ بھی نہ بھاتی تھی لہذا وہ سوشلزم اور نیشنلائزیشن کے حق میں اپنا پورا زور صرف کر دیتے۔ جوں جوں یہ تجربات ناکامی سے دوچار ہوتے گئے تو ہمیں اس پر قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ صحت، تعلیم اور خاندانی منصوبہ بندی کو موثر بنانے کے لئے ہمیں حکومت کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سونپنے چاہیں۔ ان دانشوروں نے تسلسل کے ساتھ یہ اصرار جاری رکھا کہ ہماری (عوام) کی بھلائی اسی میں ہے کہ حکومت کو زیادہ سے زیادہ کردار اور اختیار دے دیا جائے اور کچھ عرصہ قبل جب حکومت کی نااہلی کھل کر سامنے آنے لگی تو یہ این جی اوز (غیر حکومتی ادارے، جو غیر ملکی امداد سے چلائے جاتے ہیں) کے حق میں رطب اللسان ہو گئے اور یہ کہنے کی تو گنجائش ہی نہیں کہ چاہے حکومت کی طرف سے کوئی ادارے قائم ہوں یا کوئی این جی او، ان تمام کی سربراہی کا استحقاق انہی دانشوروں کا ہے۔

چونکہ ماضی میں حکومتیں ایسے دانشوروں کی بڑی خیر خواہ رہی ہیں اس لئے یہ لوگ حکومت کو فطرتاً مہربان اور خیر خواہ گردانتے ہیں اور اس تصور کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں دکھائی دیتا کہ حکومتی اہل کار اور یہ دانشور بھی لالچی ہو سکتے ہیں اور سرکاری خزانے کو لوٹ سکتے ہیں اور کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے کی جانے والی سفارشیں ذاتی فائدے کا محرک سمجھی جا سکیں۔ جہاں تک

نئے حکومتی اداروں کے قیام کا سوال ہے تو یہ محض اختیار و طاقت کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ یقیناً سوچنے کی بات ہے کہ آخر سرکاری شعبے میں قائم کئے جانے والے کتنے ادارے ایسے ہیں جو صرف اور صرف عوام کی بھلائی کے لئے بنائے گئے ہیں دراصل ان کا قیام اس لئے عمل میں لایا جاتا ہے تا کہ سرکاری افسران کو نہ صرف پبلک فنڈ سونپ دیئے جائیں بلکہ انہیں رشوت لینے کا موقع بھی فراہم کیا جائے۔

اس طرح کی سوچ کا نتیجہ یہی ہوا کہ وسائل اور انتظامی اختیارات حکومت کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گئے۔ جس کی وجہ سے حکومت کے وسائل اس قدر ہو گئے کہ وہ عنایات اور دولت بانٹنے کے قابل ہو سکی اور نہ صرف سرکاری ملازم خود بلکہ ان کے عزیزوں اور دوستوں تک نے سرکاری خزانے سے بے اندازہ دولت کمائی جس سے حکومت کی طاقت میں بھی اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایسے لوگوں کا طبقہ وجود میں آ گیا جنہوں نے ملک کو بری طرح سے لوٹ کر خوب دولت اکٹھی کی۔

جب بچے اس صورتحال کو دیکھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ محنت اور کام کرنے کے لگن کی بجائے حکومتی ذرائع سے لوٹ کھسوٹ کے ذریعے سے دولت اکٹھی کی جائے۔ اور اب یہ بچے بڑے ہو گئے ہیں اور دولت سمیٹنے کے موقعوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ہر جگہ یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے یعنی حکومت سے ٹھیکوں لائسنسوں یا آسان شرائط پر قرضے لے کر دولت کمائی جا رہی ہے اور ایسے طریقوں کو سیاسی وابستگیوں کو خریدنے کے لئے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اب اس میں کیا حیرانی کی بات ہے جب یہ بچے بھی لوٹ میں سے اپنا حصہ مانگ رہے ہیں۔ البتہ یہ حیرانی کی بات ضرور ہے کہ ہمارے دانشور اور عالم ان حالات کو سمجھنے سے ابھی تک قاصر ہیں اور ابھی تک حکومت کے کردار میں اضافے پر مصر ہیں یا پھر این جی اوز تنظیموں کے قیام اور ان کے افعال کردار کے حامی ہیں جو کہ عوام کے پیسوں سے چلائے جاتے ہیں لیکن وہ کسی کو جواب وہ قطعاً نہیں۔

(2)

ویسٹ منسٹر کی پیروی

پاکستان میں دانشوری ہماری روایت کا حصہ نہیں بن سکی نہ تو ہم نے علمی مباحث کو آگے بڑھایا اور نہ ہی اس ملک میں علم و دانش کی نمو کے لئے کسی قسم کی کوئی کوشش کی۔ ہم نے ہمیشہ حصول علم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا یا یہ سمجھا کہ ایسا کرنا تو محض شغل اور عیاشی ہے جسے موخر کر دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ سر دست زیادہ ضروری امور کی انجام دہی کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور یہ ضروری امور کون سے ہیں ان کا ہمیں بحیثیت معاشرہ کچھ علم نہیں اور نہ ہی ہمارے ہاں ایسے لائق اور اہل لوگ موجود ہیں جو ان کی نشاندہی کر کے صحیح پس منظر میں ان کا حل تجویز کر سکیں۔ دراصل علمی و فکری مباحث کی حوصلہ افزائی کی اہمیت کو ہم نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا اور نہ ہی سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی کی ضرورت پر زور دینے کی کوشش کی۔ نتیجتاً خواہ ماضی ہو یا حال یا مستقبل ان سے متعلق ہماری سوچ یا تفکر کا معیار بہت ہی عامیانہ سا ہو کر رہ گیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں علم و دانش کے عدم وجود کی وجوہات تلاش کرنا بہت مشکل ہیں۔ دانش کا یہ فقدان کیوں ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس سوال کے تسلی بخش جواب کے لئے کافی علمی کاوش اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ لیکن اعلی پائے کے دانشوروں کی کمی اور ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے علمی و فکری کھوکھلے پن کی وجہ سے کم از کم مستقبل قریب میں تو اس سوال کا جواب ملنا ممکن نظر نہیں آتا۔

تفکر و تدبر کی کمی کے باعث ہمارے معاشرے میں نعرہ بازی اور سطحی سوچ بہت عام ہو گئی ہے چنانچہ وہ حضرات جنہوں نے علمی میدان کی رہنمائی اپنے سر لے رکھی ہے انہیں فکر و تدبر سے عاری ماحول سے بہت فائدہ پہنچا اور ان حضرات نے جن نعروں کو رواج دیا ان کی تشریح کرنے کی ضرورت انہیں شاذ و نادر ہی محسوس ہوئی۔ نہ ہی انہوں نے اپنی فکر اور سوچ کو موثر اور مفصل انداز میں بیان کیا اور نہ ہی ہمارے معاشرے کے سرکردہ حضرات کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنی فکر کو تفصیل سے

لوگوں کے سامنے پیش کریں ہمارے ہاں رائج سطحی پن کے دوام کی یہی وجہ ہے اور اس سطحی پن کی ہمیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے اور ہمیں ان مسائل سے دوچار اس لئے بھی ہونا پڑا کیونکہ ہم نے ان پر توجہ دینے سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

یہ علم وفکر کے میدان میں ہمارا دیوالیہ پن ہی ہے جس کی وجہ سے ہمارے صف اول کے دانشور ہمارے ہاں موجود تمام خرابیوں کی ذمہ داری یا تو بیرونی عناصر پر ڈال دیتے ہیں یا ماضی میں اٹھائے گئے اقدامات پر۔ وہ ہر لمحہ استعماریت، سپر طاقتوں یا ماضی کی حکومت پر ہی الزام لگاتے ہیں جو بذات خود مبہم ہوتے ہیں چنانچہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تمام غلطیاں یا خرابیاں نہ تو ہماری پیدا کردہ ہیں اور نہ ہی ان رہنماؤں کا ان میں کوئی ہاتھ ہے البتہ ان خرابیوں کی ذمہ داری ان رہنماؤں پر ضرور ڈالی جاتی ہے جو طاقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ایک لیڈر یا حکومت جب کوئی بھی دعویٰ کرتی ہے یا بیان جاری کرتی ہے تو ذرائع ابلاغ اور یہ کہ نام نہاد دانشور دو طرح سے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ جن کو تو کسی قسم کا مفاد حاصل کرنا ہوتا ہے وہ حکومت کی بے جا حمایت کرنے لگتے ہیں اور وہ جن کی نظریں فائدہ پر نہیں ہوتیں وہ صرف آہ و زاری کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ کوئی بھی اتنی تکلیف گوارہ نہیں کرتا کہ متعلقہ شخص یا حکومت سے کہے کہ اپنے جاری کردہ بیان کی وضاحت کریں مثلاً آج کل یہ رواج عام ہو گیا ہے کہ تمام خرابیوں کی ذمہ داری ضیاء الحق یا نواز شریف کے دور حکومت پر ڈال دی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے بہت سے جواب طلب سوالات جوں کے توں رہ جاتے ہیں کم از کم پاکستانی اخبارات یا ذرائع ابلاغ سے تو یہی تاثر ملتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے سوالات جو میرے ذہن میں آتے ہیں اور ان کا کوئی واضح اور تسلی بخش جواب نہیں ہے مثلاً مارشل لاء حکومت اور جمہوری حکومت کام کرنے کے انداز میں کیا فرق ہے؟ کیا حکومت اپنے عمل میں مختلف ہو سکتی ہے؟ کیا جمہوری حکومت زیادہ آزاد ہے؟ کیا یہ لوگوں کی ضروریات کا بہت زیادہ میں خیال رکھ رہی ہے؟ کیا یہ اپنے لئے علیحدہ اور بہتر سمت کا تعین کرنے میں کامیاب رہی ہے؟ کیا اس حکومت کے دور میں لوگوں کے حالات میں بہتری آ رہی ہے؟ کیا اس حکومت سے متعلق ایم این اے حضرات ان لوگوں سے مختلف ہیں جنہوں نے مارشل لاء حکومت سے فائدے حاصل کئے تھے کیا یہ جمہوریت نواز شریف حکومت یا مارشل لاء حکومت سے کم کرپٹ ہے یا احساس ذمہ داری میں سے آگے بڑھی ہوئی ہے؟ ہمارے تمام تر مسائل اور حکومت کی تمام غلطیوں کے باوجود کیا حکومت یا اس کے کسی وزیر نے کبھی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے؟ شاید

سوچنے یا سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والے حضرات ان سوالات کے جواب دے سکیں۔

ان اصطلاحات کا کہ جن کا ہم کھلے بندوں استعمال کرتے ہیں ان میں سے سب سے اہم جمہوریت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم سب جمہوریت کے حامی ہیں بلکہ دنیا کا ہر رہنما خواہ اس کا تعلق دائیں بازو سے ہو یا بائیں بازو سے جمہوریت پر پختہ یقین رکھتا ہے البتہ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہئے اور خاص طور پر سیاسی فکر و فلسفہ کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ جمہوریت کی تعریف ہر سیاسی مفکر کے ہاں بدل جاتی ہے۔ مارکیٹوں کے لئے ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لے لیا جانا جمہوریت کی بنیاد ہے اس لئے انہوں نے ایک پارٹی کے آمرانہ طرز اقتدار کی جمہوریت سے آمیزش کی سعی کی جیسا کہ ماؤزے تنگ اور لینن کی تحریروں سے ظاہر ہے۔

پاکستان میں ہم جمہوریت کی بات اس طرح کرتے ہیں جیسے یہ مذہب ہو نہ تو اس سے متعلق کچھ پوچھنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ ہی سوال اٹھانے کی ہم اگرچہ جمہوریت کے معانی سے قطعاً واقفیت نہیں رکھتے مگر یہ ایمان ضرور رکھتے ہیں کہ ہماری فلاح اور نجات اسی میں ہے۔ اس لئے اس طرح کے دعوے عام طور پر سننے میں آتے ہیں کہ ایک دفعہ جمہوریت آ جائے تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے یا ہمارے ہاں تمام خرابیاں اس وجہ سے ہیں کیونکہ یہاں جمہوریت کی کمی ہے اور جمہوریت کا مطلب آزاد اور ذمہ دار حکومت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی جمہوریت ہے جو یہ سب کچھ ہمیں دے سکے گی اور ایسی جمہوریت کب کہاں سے اور کیسے آئے گی؟ اس سوال کا ایک ہی جواب جو ہمارے دانشوروں کو سوجھتا ہے وہ یہی کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ہر پانچ سال کے بعد ووٹ ڈال دینا ہی جمہوریت ہے اور محض ووٹ ڈال دینے کے عمل ہی سے ذمہ دار حکومت کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اور منتخب حکومت جو انہی جاگیرداروں پر مشتمل ہو گی جنہوں نے آمرانہ طرز حکومت کا ساتھ دیا اور نوآبادیاتی دور کے زوال پذیر اداروں کے ساتھ ہمارے یوٹوپیائی خواب کو تعبیر بخشی۔ کیا صرف انتخابات ہی ہر مرض کا علاج ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ منتخب نمائندے اپنی پرانی روایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے ذاتی مال و دولت میں اضافہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں جس سے نظام اور زیادہ کرپٹ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے دانشوروں کے پاس حسرت و یاس اور ناامیدی کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

جب بھی آپ زیر گفتگو دانشوروں، کالم نگاروں، پروفیسروں، اور مفکروں کو جمہوریت کی تعریف کرنے کو کہیں گے تو آپ وہی کچھ سنیں گے جو ہمارے نوآبادیاتی آقاؤں نے ہمیں سکھایا یعنی

ویسٹ منسٹر کی طرز کی جمہوریت ہی ہمارے مسائل کا واحد حل ہے اور برطانوی طرز کا پارلیمانی نظام حکومت جس میں وزیراعظم کو بے اندازہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں وہی ہمارے لئے واحد راستہ ہے اور اس حقیقت کی طرف قطعاً کسی کا دھیان نہیں جاتا کہ انگریزوں نے کئی صدیوں اور ان گنت انقلابوں سے گزر کر اس نظام کو قائم کیا۔ اور ہمارے دانشور اس سے صرف نظر کرتے ہیں کہ اس تمام ارتقائی عمل جس سے انگریزوں کو گزرنا پڑا۔ وہ بہت سی روایات کا موجب بنا۔ مثلاً ایک فریق کو چھوڑ کر ذاتی مفاد کے لئے دوسرے فریق سے جا ملنا اور اپنی سیاسی وابستگیوں کو تبدیل کر لینا۔ علاوہ ازیں دوسرے جمہوری نظام ہائے حکومت سے ہم نے قطعاً کوئی سبق نہیں سیکھا مثلاً امریکی نظام یا فرانسیسی نظام وغیرہ۔

اسی طرح کی سوچ سے تحریک حاصل کر کے ہمارے آئین تحریر کرنے والے حضرات نے بھی ویسٹ منسٹر کی نقل کر لینے پر قناعت کرنا مناسب سمجھا اور اس ضرورت کو خاطر میں لائے بغیر کہ ایسے اقدامات کئے جائیں کہ جمہوی ادارے جڑ پکڑ سکیں اور نمو پا سکیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ برطانوی جمہوری نظام پوری طرح سے متحرک ہے اور صدیوں کے ارتقائی عمل سے گزر کر پختگی حاصل کر چکا ہے۔ جبکہ ہمیں ایک نیا نظام تشکیل دینا ہے۔ جیسا کہ کوئی میکینیکل انجینئر ہمارے فاضل دانشوروں کو حرکت کے قوانین کے حوالے سے بتا سکے گا کہ کسی بھی نظام (سسٹم) کو حرکت دینا مشکل ہوتا ہے بہ نسبت ایک پہلے سے متحرک نظام کے معیار و رفتار کی نگرانی کرنے کے۔ بعینہٖ ہمیں اپنے جمہوری نظام کو پورا زور صرف کر کے متحرک کرنا ہے پھر انجن کو ضرورت کے مطابق حرارت فراہم کرنی ہے تا کہ معیار رفتار کو برقرار رکھا جا سکے جیسا کہ ہمارے دوست مکینیکل انجینئر بتائیں گے اس تمام کارروائی کے لئے بے پناہ قوت اور محتاط نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ ایک دفعہ انتخابات کا اگنیشن گھمائیں اور سارے کا سارا نظام بالکل صحیح خطوط پر خود بخود حرکت کرنے لگ جائے۔ بلکہ اس کے لئے دوسرے لوازمات اور مسلسل زور صرف کرتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کم از کم دس برسوں تک انتخابات ہر سال کروائے جائیں تو یہ سیاست دانوں کو ذمہ دار بنانے کے لئے نہایت سودمند ہوگا۔ اور اگر آئین میں ایسی ترامیم متعارف کرائی جائیں جن کے ذریعے ایسے Check & Balance کا نظام وجود میں لایا جائے کہ اختیارات ایک ہی جگہ مرکوز نہ ہوں بلکہ یہ تقسیم ہوں کیونکہ اختیارات کا ارتکاز کرپشن کو جنم دیتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم امریکی آئین میں موجود Check & Balance کے نظام کے علاوہ اختیارات کی تقسیم سے بھی بہت حد تک رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں انگلستان کی غلطیوں سے بھی سبق سیکھنا چاہئے جو اس کے اپنے نظام کے ارتقائی مراحل

میں سرزد ہوئیں۔اس کے علاوہ ان سب سے جنہوں نے اپنے ہاں چیک اینڈ بیلنس کا نظام تشکیل دیا اور ذمہ دار حکومتوں کا وجود ممکن بنایا۔اس ضمن میں ہمارے فاضل مکینیکل انجینئر ہمیں بہت کچھ بتا سکتے ہیں لیکن ہمارے راہبر سننے کے لئے تیار ہوں تو۔

تاریخی شواہد کی موجودگی میں بھی روایت پرست دانشور فرسودہ اور گھسے پٹے نظریات سے چمٹے رہتے ہیں ہم نے بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ آج کل جس طرح انتخابات ہوتے ہیں ان سے ہمیشہ انہیں لوگوں کا پارلیمنٹ میں آنے کا امکان ہوتا ہے جنہوں نے ماضی میں خواہ جمہوری حکومت ہو یا غیر جمہوری ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔چنانچہ یہ بات نہایت واضح ہے کہ صرف انتخابات منعقد کرانے سے ہی ذمہ دار حکومت کا قیام نہیں ہوسکتا۔کیونکہ اس طرح حکومت کرنے کا طریقہ،قانون کے ضوابط اور باقی ادارے تو تبدیل نہیں ہو پاتے خواہ حکومت جمہوری ہو یا غیر جمہوری لہذا متعدد کوششوں کے باوجود نظام کو چالو کرنے میں ناکامی ہی ہوئی۔اب اگر فاضل مکینیکل انجینئر سے پوچھیں گے تو وہ ہمیں انجن (نظام) کی ساخت پر توجہ دینے کو کہے گا۔جمہوریت کے انجن کی راہ میں قانون ساز ادارے ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔کیونکہ وہاں موجود حصرات ذاتی مفادات کو ہی پورا کرنا کافی سمجھتے ہیں اور قانون سازی کا کام جو ان کی بنیادی ذمہ داری ہے اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے میرے خیال میں اس طرح کے ادارے قائم کئے جانے چاہیں جن کی مدد سے سیاست دانوں کے اثاثوں اور سیاسی فوائد کے بارے میں عوام کو آگاہ کیا جاسکے اور انہیں (عوام) کو قانون سازی سے متعلق قدروں کی زوال پذیری سے باخبر کیا جاسکے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے فاضل مکینیکل انجینئر سے سیکھ لیں۔آیئے جمہوریت کے ڈھانچے پر احتیاط سے نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ہم اس میں کیسے اور کتنی ایک تبدیلی لا سکتے ہیں تا کہ جمہوریت کے ثمرات ہمیں میسر آ سکیں۔بہرحال یہ بات تو طے ہے کہ سراسر جمہوری ڈھانچے کو قائم رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔آیئے ہم پہلے جمہوریت کی تعریف کریں اسے سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کا تعین کریں کہ ہم اس سے کیا چاہتے ہیں۔پھر ہمارے پاس جو ذرائع موجود ہیں سے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔تبھی ہم منتخب رہنماؤں میں بہتری پیدا کرنے اور انہیں اس قابل بنانے کہ وہ جمہوری روایت کو عملی تعبیر بخشیں اس میں کامیاب ہوسکیں گے۔یوں تو ہم سب جمہوریت پر متفق ہیں لیکن کونسا جمہوری نمونہ اپنایا جائے اس پر اختلاف موجود ہیں۔لیکن کیا ایسا ممکن نہیں کہ بحث مباحثہ سے کوئی بہتر نمونہ مل جائے تا کہ ہم اسے اپنا سکیں۔

(3)

اکیڈمکس: ان کی فطرت، کردار اور اہمیت

اکیڈمکس کی وضاحت

پاکستان میں اکیڈمک (ماہر نصاب، ماہر تعلیم) کی اصطلاح سے وہ کچھ مراد لیا جاتا ہے جو صنعتی اور ترقی یافتہ معیشت رکھنے والے معاشروں میں قطعاً ناپید ہے۔ بہت سے ممالک میں اکیڈمکس (ماہر نصاب و تعلیم) ہی کی وجہ سے یونیورسٹیوں کو وقار اور احترام ملا۔ اکیڈمکس وہ افراد ہوتے ہیں جو کسی خاص علم کی شاخ میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں وہ اس طرح ہرگز نہیں ہوتے کہ پروفیسر کے مرتبہ تک پہنچ کر سیکھنے سوچنے اور تحقیق کرنے کے عمل کو یکسر خیر باد کہہ دیں۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ افراد جو اکیڈمکس کہلاتے ہیں اور علم کے کسی میدان میں کمال حاصل کر لیتے ہیں وہ کبھی سیکھنے اور تحقیق کرنے سے دست کش نہیں ہوتے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اپنے میدان میں نئی منزلوں کا کھوج لگاتے رہیں۔

اکیڈمکس تخلیقی رویہ اور جستجو رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ حاضرین مجلس پر رعب ڈالنے کے لئے صرف بڑ لگانے پر ہی اکتفا کر لیں۔ یہ حضرات کئی کئی ماہ اور کبھی تو سالہا سال تک تحقیق کرتے ہیں۔ تجربات اور مشاہدے کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اعداد و شمار کی جانچ پڑتال بھی بڑی جانفشانی سے کرتے ہیں اور اس کے بعد بہت اچھے انداز میں تحریر کر کے بھرپور حوالہ جات کا استعمال کرتے ہوئے عقل سلیم کو پسند آنے والے دلائل کو کام میں لا کر تحقیقی مقالہ تیار کرتے ہیں اور اسے علمی حلقوں کے معروف جرنلز میں چھپواتے ہیں۔ جب یہ تحقیقی مقالہ جرنل میں چھپنے کے لئے جاتا ہے تو جرنل سے متعلق لوگ اسے اس شعبے کے ماہرین کے پاس بھیجتے ہیں جس سے وہ مقالہ متعلق ہوتا ہے اور ان ماہرین کی آرا کے بعد مقالے کو چھاپا جاتا ہے یا اگر وہ غیر معیاری ہو تو اسے مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک ماہر نصاب و علم بہت سی کڑی آزمائشوں سے گزر کر کسی مرتبہ

تک پہنچ پاتا ہے نہ کہ محض اخبارات میں کالم نگاری کر کے یا ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں شامل ہو کر سستی شہرت کے ذریعے جیسے کہ پاکستان میں ہوتا ہے۔

دنیا بھر میں کسی بھی ماہر نصاب وعلم کی پہچان اپنی مخصوص شاخ علم میں تصنیف وتالیف کی مقدار اور معیار ہوتا ہے۔ اس کی تصنیف وتالیف کے معیار کو جانچنے کے لئے عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ موصوف کی تحریریں کس پائے کے جرنل میں چھپتی ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اکیڈمک کی اپنے شعبہ علم میں جدید رجحانات سے کس قدر آشنائی ہے اور اس میں جدت پیدا کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔

زبانی وتحریری روایات

بہت دیر اور پختگی سے قائم علمی روایت یہی ہے کہ تمام باکمال محقق معروف تحقیقی رسائل میں اپنے مقالہ جات چھپوانے کی خواہش رکھتے ہیں اس لئے ماہرین کی جانچ پڑتال سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کی جانے والی تحقیق بنیادی نوعیت کی ہے یا نہیں۔ علم کے ماہرین کی قدر اور ناموری اس طرح کے اعلیٰ پائے کے تحقیقی مقالات کی تعداد سے متعین ہوتی ہے۔ اس طرح کے مقالات اور تحقیقی رسائل جب تواتر کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں تو وقت گزرنے کے ساتھ ملک میں علمی بحث مباحثہ کی فضا جنم لیتی ہے اور جوں جوں یہ مسائل کو ابھارتے اور واضح کرتے ہیں تو اس سے دانشورانہ اور علمی روایات وجود میں آتی ہیں۔

جوں ہی اس طرح کی تحقیق میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں پیش آمدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے بھی کوششیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس چھپے ہوئے علمی مواد سے علمی حلقوں میں تحریری روایات ظہور پذیر ہوتی ہیں اور نئی فکری راہیں بھی کھلتی ہیں جس سے مختلف مسائل وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آتے ہیں جب تحقیقی مواد تیزی کے ساتھ وجود میں آتا ہے تو بہت سے خیالات وافکار بھی اسی تیزی سے وجود میں آتے ہیں اور بعض اوقات غیر تحریری (زبانی) افکار اور نظریات بھی پیش کئے جاتے ہیں جو اس تیز رفتار عملی دنیا میں تسلیم کر لئے جاتے ہیں اور جب وہ لوگ جو تیز رفتار عملی زندگی میں ملوث ہوتے ہیں اور مذکورہ بالا افکار ونظریات سے فیض یاب ہوتے ہیں تو ان لوگوں کی تعداد بڑھنا شروع ہوتی ہے اس سے دانشورانہ اور علمی دیانت میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں زبانی افکار کے اظہار کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور فکر کو اس کے خالق ہی سے منسوب کیا جاتا

ہے اس طرح تحقیق کے دونوں تحریری اور زبانی اظہار کسی بھی معاشرے میں علمی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔

علم و دانش سے رچے ہوئے اس ماحول میں یہ روایات دانشورانہ دیانت اور ایمانداری کو یقینی بناتی ہیں اور کریڈٹ اسے دیا جاتا ہے جو فکر اور جدت کو تخلیق کرتا ہے وہ فرد جو ایک نظریہ پیش کرتا ہے خواہ وہ زبانی ہو یا تحریری اسے اس نظریہ کا خالق گردانا جاتا ہے اگر اس سلسلے میں بد دیانتی کی جائے تو دوسرے محققین کے ذریعے پکڑے جانے کا احتمال ہوتا ہے جو نظریہ سازی کے عمل کو غور سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح علمی ماحول میں خود اصلاحی کا عمل بہت خوبی سے انجام پاتا ہے اور صحت مند دانشورانہ اطوار اور مباحث جنم لیتے ہیں۔

دانشورانہ روایات صرف اخلاقی حوالے ہی سے ضروری نہیں بلکہ یہ معاشی اعتبار سے بھی بہت اہم ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جو نئے نظریات کو تخلیق کرتے ہیں اگر انہیں اس تخلیق کا کریڈٹ دیا جائے تو یہ تخلیق مزید کا محرک بنے گا۔ تخلیق کا سب سے بڑا انعام قدر شناسی (Recognition) ہی ہے اور اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ نئی دریافت یا تخلیق اسی سے ہی منسوب کی جائے گی جس کا صحیح حق ہوگا اور قدر شناسی (Recognition) بھی اسے ہی ملے گی تو فن تخلیق اور محنت کو مزید جلا ملے گی۔

اعلیٰ پائے کا اکیڈمکس کی اہمیت

علم کی سرحدوں کو وسیع کرنے کے لئے مسلسل کام سے دانشورانہ قابلیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس معیار کے کام سے معاشرے کا نئے سرے سے تجزیہ کرنے میں مدد ملتی ہے اور سماجی سائنس کی سطح پر معیشت کے نئے اصول وضع ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پیداواری عمل سے متعلق نئے طریقے (Techniques) بھی پتہ چلتے ہیں اور یہی کچھ نیچرل سائنس کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اور جب وقت کے ساتھ یہ علم اکٹھا ہوتا ہے تو سماجی سیاسی اور معاشی ڈھانچے میں تبدیلی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔

بہتر اور موثر پالیسیاں بھی علم کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہیں۔ جیسے مستقل مزاجی سے کی گئی تحقیق سے نئی شہادتیں آشکار ہوتی ہیں اور ان کا امتہ الناس کو پتہ چلتا ہے اور ممکنہ ترقی کے بارے میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہ شعور تبدیلی کے عمل کو ممکن بنانے میں مدد دیتا ہے۔

مستقل مزاجی اور محنت سے کی گئی تحقیق کے بغیر پالیسی کی صحیح طور پر تشکیل ممکن نہیں ہوتی اور عوامی بھی بے خبر ہی رہتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے ضروری ترقی نہیں ہو پاتی اور پالیسیاں بھی نافذ العمل نہیں ہوسکتیں۔مزید براں ملک اس ترقی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو بہتر ریسرچ کے بعد بننے والی پالیسیوں کے نتیجے میں معاشی میدان میں ممکن ہوسکتی ہے۔

پاکستانی اکیڈمکس

پاکستان میں علم ونصاب کبھی جڑیں نہیں پکڑ سکا۔علمی سرگرمیوں آموزش یا پیشہ وارانہ فن کو ایسا گھٹیا کام سمجھا جاتا ہے جو کمی اور بے عزت لوگوں کے کرنے کا ہو۔یہاں اساتذہ کی تنخواہیں بھی ہمیشہ سے بہت کم رہی ہیں اوپر سے ستم یہ کہ وہ منتظمین (Administratiors) کو جواب دہ ہوتے ہیں جو انتہائی روکھے اور تخیل سے عاری ہوتے ہیں اور انہی کی وجہ سے ہمارے تعلیمی ادارے اور روایات مردہ ہوگئی ہیں۔لیکن پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں تھوڑا بہت نصابی اور علمی کام ہورہا ہے جو غنیمت ہے۔

ہمارے ملک میں ماہرین علم ونصاب کی کمی ہے لیکن بظاہر اونچا مرتبہ رکھنے والے کئی ایک دانشور آپ کو ضرور مل جائیں گے۔جن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر طرح کے علم پر دسترس رکھتے ہیں۔چونکہ پاکستان میں علم سے شغف رکھنے والے حضرات کی بہت کمی ہے چنانچہ ان عالموں اور دانشوروں کی جانچ موثر انداز سے نہیں ہو پاتی یہ عالم اور دانشور مختلف حیلے بہانوں سے ان پڑھ یا نیم خواندہ لوگوں سے ہی مخاطب ہونا پسند کرتے ہیں اور انہی نیم خواندہ لوگوں کے ذریعے ان کی قدر و قیمت بھی متعین ہوتی ہے۔مذکورہ بالا عالم اور اہل دانش مزید تحقیق اور علم کی راہ میں جانفشانی دکھانے کی بجائے اپنے اونچے مرتبے کے اظہار کے ذریعے عام لوگوں میں اپنے آپ کو ممتاز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اپنے آپ کی تشہیر کرنے اور اپنی اہمیت میں اضافہ کرنے کے لئے یہ حضرات جو ہتھکنڈے اپناتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

1- اخبارات کے لئے علمی نوعیت کے مضامین لکھنا تاکہ عام قارئین خاص طور پر بیوروکریٹ اور نام نہاد دانشوروں کی توجہ حاصل کی جاسکے جو اخبارات کے مضامین ہی کے ذریعے ممکن ہوسکتی ہے وہاں بھی زیادہ سے زیادہ امکان اس بات کا ہوتا ہے کہ وہ مضمون کو پڑھنے کا تکلف بھی نہ کریں تو بھی لکھنے والے کے نام سے تو واقف ہو ہی جائیں گے۔

2- بڑے بڑے ہوٹلوں میں منعقد ہونے والی اہم کانفرنسوں میں خوبصورت زبان سے مصرع رومانوی تحریروں کے ذریعے ترقیاتی منصوبوں کے حوالے سے اظہار خیال کرنا۔ ان کانفرنسوں میں موجود وزراء و دیگر اہم شخصیات اور امداد دینے والی تنظیموں کے نمائندے جب زبان و بیان سے سجی ہوئی تقاریر سنتے ہیں تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے چنانچہ ان حضرات کو مزید کانفرنسوں میں بلایا جاتا ہے اور مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔

3- حضرات اصطلاحات جو مخصوص عہد میں استعمال کی جاتی ہیں ان سے اپنے آپ کو باخبر رکھتے ہیں اور یہ اصطلاحات پیسے فراہم کرنے والی ایجنسیوں کے نمائندوں کو بہت متاثر کرتی ہیں وہ نام نہاد دانشور جو بین الاقوامی دنیا میں متعارف ہونے والی اصطلاحات کو جلد سے جلد کانفرنسوں میں تقاریر یا اخبارات کے مضامین میں استعمال کر لیتے ہیں انہیں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

4- دانشور کے لئے اشد ضروری ہوتا ہے کہ وہ دانشوروں کے کسی نہ کسی گروہ میں شامل ہو جائے کیونکہ یہ گروہ اپنے اراکین کو مقبول بنانے ان کا ہر مشکل وقت میں دفاع کرنے اور ان کی حمایت کرنے میں ید طولی رکھتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ ہمارے ملک میں سماجی و سیاسی ضبط نامے پر برادریاں چھائی ہوئی ہیں۔ دراصل دانشوروں کا ان گروہوں سے باہر رہ کر ترقی کرنا اور پھلنا پھولنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایک تخلیقی ذہن کا مالک یا غور و فکر کرنے والا مصنف اگر کسی گروہ سے وابستہ نہ ہو تو اس کی حیثیت کسی گروہ سے وابستہ ادنی سے ادنی مصنف سے بھی کم تر ہو جاتی ہے۔

5- پیسے فراہم کرنے والے افراد کے ساتھ اچھے تعلقات کو قائم رکھنا کیوں کہ وہاں سے نہ صرف رقم آتی ہے بلکہ کانفرنسوں کے دعوت نامے بھی آتے ہیں کسی بھی دانشور کی اہمیت کو متعین کرنے کا ایک معیار یہ بھی ہوتا ہے کہ اسے چندے کے طور پر کتنی رقم ملتی ہے۔ علاوہ ازیں جو کوئی اچھی انگریزی بولنے پر قدرت رکھتا ہو اس کے علم و نصاب کے آسمان کا ستارہ بننا چنداں مشکل نہیں۔ اس نوع کے دانشوروں کی نہ صرف عزت و تکریم کی جاتی ہے بلکہ انہیں ہر طرح کے علم کا سرچشمہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ان پر محتاط انداز میں تحقیق کرنے اور ان کے مخصوص میدان میں ہونے والی تازہ ترین پیش رفت سے باخبر رہنے کیلئے کوئی دباؤ نہیں ڈالتا یہی وجہ ہے کہ ہمارے اہل علم و دانش بین الاقوامی

معیار سے بہت پیچھے ہیں اور تو اور انہیں اپنے معاشرے اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی بھی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی۔

سنجیدہ علمی کوششوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کا مشاہدہ کیا جائے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے اگر چہ یہ بات بہت حد تک طے ہو چکی ہے کہ کسی بھی عمل کی مکمل اور بالکل صحیح توجیہہ کرنا ممکن نہیں پھر بھی ایسے نظریات اور فکری ڈھانچوں کو ترویج دیا گیا ہے تا کہ کسی نہ کسی طرح اس عمل کو ہمارے ہاں بھی اپنایا جا سکے۔ اس لئے ہمارے دانشوروں کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ایسے نظریات و فکری ڈھانچوں سے واقفیت حاصل کریں جو ان کے مخصوص شعبے میں بہت تیزی کے ساتھ وجود میں آ رہے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ دنیا کے بہترین محققوں کے تخلیقی مقالات سے وہ بہت جلد استفادہ حاصل کر لیں اس سے پہلے کہ یہ تحقیقی مقالے رسائل کی زینت بن کر ہر خاص و عام کی نظروں میں آ جائیں۔

لیکن پاکستانی دانشوروں کو جدید نظریات کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی وہ کسی نظریے کی مدد کے بغیر کائنات کو یوں ہی سمجھ لینا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ تمام نظریات جو سمندر پار کے ممالک کی دریافت ہیں ہمارے معاشرے کے لئے قطعاً سودمند نہیں۔ ہمیں بالکل مختلف، مقامی حالات سے مطابقت رکھنے والے نظریات کی ضرورت ہے جو ہماری رسوم و روایات سے میل رکھتے ہوں۔ چنانچہ ہمارے دانشوران دلائل سے تمام لوگوں کو مطمئن کر کے فصیح و بلیغ تقاریر کے ذریعے یوٹوپیائی خیالات جو رومانوی داستانوں کی زبان میں بیان کئے جاتے ہیں حاضرین کو متاثر کر لیتے ہیں جب ہم اس وجد کی حالت سے بیدار ہوتے ہیں تو ہم حیرانی کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ ہم نے کیا پایا اور کیا سیکھا؟

(4)
ڈونر فنڈنگ اور پاکستان میں تحقیق کے میدان میں ترقی کے امکانات

کسی بھی معیشت میں کئی دوسری سرگرمیوں کی طرح تحقیق کا انحصار بھی پیسے کی فراہمی پر ہوتا ہے۔لیکن بدقسمتی سے تحقیق اور پیسے کی فراہمی (Funding) کے اس تعلق کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تحقیق کی سمت کا تعین پیسے کی فراہمی سے مشروط ہو جاتا ہے۔تحقیق کی سمت اور اس کا ایجنڈا کسی بھی معاشرے کے لئے اس لئے بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ تحقیق ہی پالیسیوں کے تعین میں رہنماء کا کام دیتی ہے۔مثال کے طور پر منصوبہ بندی اور بنیادی ضروریات سے متعلق تحقیقی نظریات نے ہمارے منصوبہ سازوں کو نیا تخیل عطاء کیا جس کے باعث یہاں کی سوچ اور پالیسیوں میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

بدقسمتی سے بیشتر ترقی پذیر ممالک کی طرح پاکستان میں مقامی سطح پر تحقیق اور علمی سرگرمیاں بہت پسماندگی کا شکار ہیں جس کی وجہ سے تحقیق کے لئے نظام العمل (Agenda) صحیح طور پر واضح نہیں ہے جسے مرتب کرنا یہاں کے اہل علم و دانش کی ذمہ داری ہے۔ان ممالک میں اہل علم و دانش نظریات و افکار سے متعلق کسی قسم کی رہنمائی فراہم نہیں کرتے بلکہ ان کی نظر ان ذریعوں پر ہوتی ہے جہاں سے انہیں زیادہ سے زیادہ پیسے مل سکیں۔

مشیروں کا معیار

سرمائے کے فراہم کنندہ (Donors) اور حکومت دونوں نے اس بنا پر کہ ملک علم اور نصاب کے میدان میں ابھی بہت ابتدائی مرحلے میں ہے اس لئے انہوں نے ملک کے تمام بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق تربیت دینے کا اہتمام کر لیا۔ان دونوں میں سے بھی چونکہ سرمایہ پر کنٹرول

ڈونرز کا ہوتا ہے اس لئے وہی حالات کو اپنی گرفت میں لئے رہتے ہیں اور حکومت کی حیثیت محض ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ عموماً ڈونرز اور حکومت ایک دوسرے سے تعاون کر کے ایک نیا تحقیقی مرکز نئی یونیورسٹی یا ایک این جی او قائم کر لیتے ہیں۔ ان اداروں کو چلانے کے لئے بہت سا پیسہ خرچ کر کے غیر ملکی ماہرین کو بلایا جاتا ہے اور ان کے ذمے علم و تحقیق کا کام لگا دیا جاتا ہے۔ یہ ماہرین عام طور پر وہ حضرات ہوتے ہیں جن کی اپنے ملک میں یا باقی ماندہ ترقی یافتہ ممالک میں کوئی وقعت نہیں ہوتی اور وہ صنعتی ممالک میں ماہرین علم و نصاب کو پیش آنے والے چیلنجوں اور دیگر مشکلات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے چنانچہ وہ یا تو وہاں ریٹائر ہو چکے ہوتے ہیں یا ریٹائر ہونے والے ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں یہاں کسی قسم کا کام سونپ کر کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

پھر بھی ان مشیران (Consultants) کو یہاں بہت سی سہولتیں، اعلیٰ مرتبہ اور کئی پاکستانی نائبین فراہم کئے جاتے ہیں۔ یا بہت زیادہ تنخواہ پانے والے سرکاری ملازمین ان کی خدمت پر مامور کر دیئے جاتے ہیں جن کو غیر ملکیوں سے تعلق پیدا کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ ان غیر ملکی مشیران یا ماہرین کی انا کو تسکین پہنچانے کے لئے مقامی لوگوں کی نا اہلیت پر بڑھ چڑھ کر گفتگو کرتے ہیں اور غیر ملکیوں کی خوشامد میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگتے ہیں۔ اکثر اوقات تو باہر سے منگوائے ہوئے مشیران ہی کو مقامی ماہرین پر نگران مقرر کر دیا جاتا ہے اور منصوبے کی تکمیل کی تمام تر ذمہ داری انہیں کو سونپ دی جاتی ہے۔

غیر ملکی مشیر (Consultant) ہمیشہ اسی عمل کی ابتداء کرتے ہیں جس سے ان کو زیادہ واقفیت ہوتی ہے۔ اکثر یہ حضرات کسی قسم کی جدت کو عمل میں لانے سے عاری ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان میں یہ صلاحیت ہوتی تو اس کی کارکردگی ان کے اپنے ملک میں بہت عمدہ رہی ہوتی اور اسے تیسری دنیا کے کسی ملک میں جا کر اپنی خدمات پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اور بالغرض غیر ملکی مشیر بہت با صلاحیت بھی ہو تب بھی اس کے پاس اتنا وقت اور لگن نہیں ہوتی کہ وہ کوئی مثبت تبدیلی لانے میں ممد و معاون ہو سکے۔ یہ لوگ زیادہ سے زیادہ تین سال کی مدت کے لئے یہاں آتے ہیں یہاں انہیں نئے سرے سے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا ہوتا ہے جنوبی ایشیاء کو دیکھنا، قالین، یادگار چیزیں (Soovenurs) اور عام استعمال کی اشیاء کی خریداری کے مراحل سے گذر کر اب اگر ان میں دلچسپی ہو تو پاکستان کے بارے میں تھوڑا بہت جاننے کی کوشش کرتے ہیں پراجیکٹ کے ضمن میں آئی ہوئی رقم کا بیشتر حصہ سیر و تفریح و دیگر سہولیات اور غیر ملکی مشیران اور ان کے ساتھیوں

کے شاہانہ طرز زندگی کی نذر ہو جاتا ہے۔اور جب یہ پیسہ ان کاموں پر صرف ہو جاتا ہے تو مشیران اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔اور وہ ادارہ جو ڈونرز کے پیسے سے قائم ہوتا ہے اس کا بھی کچھ اتہ پتہ معلوم نہیں ہو پاتا۔

بدقسمتی سے اس تمام مرحلے میں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے جس کے باعث اہل پاکستانی پیشہ ور ماہرین ایسے منصوبوں سے دور دور ہی رہتے ہیں کیونکہ ڈونرز اور حکومت انہیں وہ اہمیت نہیں دیتی جو کسی غیر ملکی ماہر یا مشیر کو دی جاتی ہے خواہ وہ ہر قسم کی صلاحیتوں سے مکمل طور پر عاری کیوں نہ ہوں اور منصوبہ سازوں کے ذہنوں میں بھی ایک ایسے ادارے کا خاکہ ہوتا ہے جس پر پیسے خرچ ہو سکیں۔

ڈونرز کے فراہم کردہ سرمائے کا حجم

ہمیں فراہم کیا جانے والا پیسہ جس سے ہماری مشکلات دور کی جانی چاہیں ڈونرز اس پیسے کو اپنے ہی ملک سے تعلق رکھنے والے ماہرین علم و نصاب کو ملازمتیں فراہم کرنے پر خرچ کر دیتے ہیں۔(1990ء میں تکنیکی امداد کے لئے پاکستان کو دی جانے والی گرانٹ اس کے کل واجب الادا قرض کا 12 فیصد تھی اور سماجی خدمات (Social Services) کے شعبے میں خرچ کی جانے والی کل رقم کا 33 فیصد تھی) اس تمام تر رقم پر ڈونرز کو کلی اختیار ہوتا ہے۔چونکہ یہ گرانٹ ہوتی ہے اس لئے ہم اسے برضا و رغبت قبول کر لیتے ہیں اور جہاں تک اس رقم کو خرچ کئے جانے کا سوال ہوتا ہے تو ہم اس کے بارے میں کوئی توجہ نہیں دیتے۔وہ رقم جو ہمارے کل واجب الادا قرضے کا 12 فیصد ہو یا سماجی خدمات کے شعبے پر خرچ کئے جانے والے پیسے کا 33 فیصد ہو کوئی چھوٹی موٹی رقم نہیں ہوتی اگر اسے ہم اپنے قرضے کے بوجھ کو کم کرنے پر خرچ کریں یا اپنی تعلیمی ضروریات اور صحت سے متعلق سہولیات میں اضافہ کرنے پر خرچ کریں تو اس رقم کا یہ بہتر استعمال ہوگا۔

ڈونرز نہ صرف یہ کہ گرانٹ کے طور پر ملی ہوئی رقم کو اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں بلکہ قرض کے طور پر ملی ہوئی رقم کا بڑا حصہ بھی انہی کے کنٹرول میں یوں ہوتا ہے کیونکہ وہی ہمیں بتاتے ہیں کہ اس رقم کو کیسے خرچ کرنا چاہئے اب یہ وہ پیسہ ہے جسے عام پاکستانی نے اپنے پیسوں سے سود کے ساتھ آئندہ برسوں میں واپس کرنا ہے۔حتیٰ کہ وہ قرض جو ہم پاکستان میں Infranstructure کے قیام کے لئے حاصل کرتے ہیں اس کا استعمال بھی آزادانہ طور پر نہیں ہو سکتا اور غیر ملکی ماہرین و

مشیران ان کا باریک بینی سے مشاہدہ ومطالعہ کرتے ہیں۔اس طرح ہم جب بھی کوئی منصوبہ بناتے ہیں تو غیر ملکی ماہرین کی غیر معتبر رپوٹوں کی وجہ سے اس کے ضروری اخراجات بہت بڑھ جاتے ہیں اور اس کا بنیادی طور پر فائدہ غیر ملکی فرموں ہی کو ہوتا ہے۔

ہزار ہا طریقوں سے ڈونرز اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ گرانٹ یا قرضے کی رقم کا کافی بڑا حصہ انہی کے اپنے مشیروں کو معاوضے کی صورت میں مل جائے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا ہے بڑی بڑی مشاوراتی فرمیں جنہیں اچھے پیشہ ور ماہرین کی خدمات شاذونادر ہی میسر آتی ہیں وہ یہاں کی حکومت سے بہت بڑے معاہدے کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔یہ اچنبھے کی بات ہے کہ ماضی میں اسی طرح کی فرموں نے ہی برے بڑے معاہدے کئے۔اب تو یہ ہونے لگا ہے کہ یکا یک بین الاقوامی ایجنسیاں قائم ہوجاتی ہیں جو ترقی پذیر ممالک میں گھس آنے کے بعد مشاوراتی حیثیت میں ڈونرز سے فنڈز حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوجاتی ہیں۔اس طرح کی بین الاقوامی ایجنسیاں دونوں فریقوں سے اپنا حصہ وصول کرتی ہیں علاوہ ازیں یہ بہت سے غیر ملکی مشیران کو خطیر تنخواہوں اور Hardship allowance پر بھرتی کر لیتی ہیں اس طریقے سے اس بات کو یقینی بنالیا جاتا ہے کہ گرانٹوں کی صورت میں بمع قرض کے طور پر ملنے والی رقوم کا بیشتر حصہ واپس انہی ممالک میں چلا جائے جہاں سے یہ آیا تھا۔

ڈونرز اور پالیسی

ڈونرز کے پیسوں سے ہونے والی تحقیق کا ایک اور بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کی پالیسی اور ایجنڈے طویل دورانیئے کے لئے موثر نہیں ہوتے اور داخلی سیاسی ترجیحات کے تابع ہوتے ہیں۔ بیشک غیر ملکی ماہرین ومشیران بیحد قابل ہی کیوں نہ ہوں تحقیقی ایجنڈا مقامی حالات سے عموماً مطابقت نہیں رکھتا۔ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ اگر یہ مشیر اوسط درجے کے مشیروں سے بہتر ہوں تب بھی یہ لوگ یہاں صرف 2 یا 3 سال کی مدت کیلئے آتے ہیں اور جب وہ مقامی حالات سے تھوڑے بہت واقف ہونے لگتے ہیں تو ان کے قیام کی مدت پوری ہوجاتی ہے اور وہ واپس چلے جاتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈونرز کے فراہم کردہ سرمائے سے کیا جانے والا کام طویل المعیاد ایجنڈے سے محروم ہوتا ہے اور تمام تر تحقیق طلب مقامی مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔ڈونرز ایجنسیوں کے ماہرین مقامی سطح کے مسائل پر زیادہ توجہ دینے کی بجائے بین الاقوامی افکار ونظریات کو

زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان ایجنسیوں کی طرف سے اٹھایا جانے والا ہر قدم بیکار جاتا ہے۔ تحقیق کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بین الاقوامی طور پر فیشن بن چکے ہوں اور اس طرف بھی کوئی دھیان نہیں دیتا کہ آیا پہلے جن موضوعات پر کام شروع کیا گیا تھا وہ مکمل بھی ہوا ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر کچھ ہی عرصہ پہلے تک ''بنیادی ضروریات'' ''خواتین کی ترقی'' اور شمولیت (اشتراک) وغیرہ جیسے موضوعات پر کام کرنے کا عام رواج تھا مگر آجکل ''آلودگی'' کا موضوع رائج العام ہے۔

چونکہ تحقیق اور فکر ہی پالیسی بنانے میں رہنماء کا کام دیتی ہیں اور اگر تحقیق اور پالیسی کا ایجنڈا ڈوونرز کا ترتیب دیا ہوا ہو تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہماری پالیسی کی ترجیحات انہی (ڈونرز) کی طے کردہ ہیں۔ چنانچہ جب وہ چاہتے ہیں کہ ہم ''خواتین کی ترقی'' پر توجہ دیں تو ہم بلا سوچے سمجھے ان کا اتباع شروع کر دیتے ہیں اور جب وہ ہمیں این جی اوقائم کرنے کو کہتے ہیں تو ہم اپنا پورا دھیان اسی طرف لگا دیتے ہیں اور اب جبکہ وہ ہمیں ''آلودگی'' کے بارے میں فکر کرنے کو کہہ رہے ہیں تو ہم باقی تمام منصوبے ادھورے چھوڑ کر اپنے سارے ذہنی و مالی وسائل اس طرف لگا رہے ہیں۔ ذرائع کو ایک طرف سے دوسری طرف بہت تیزی سے موڑ دیا جاتا ہے اور یہ جاننے یا تجزیہ کرنے کی جسارت نہیں کی جاتی کہ ان منصوبہ جات کا کیا مستقبل ہوگا جنہیں نامکمل چھوڑ کر نئے منصوبوں کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ بدقسمتی سے حکومت اور دانشور دونوں ڈونرز کے پیسوں کے پیچھے اس جانفشانی سے دوڑ رہے ہیں کہ معیشت کے بنیادی مسائل پر تحقیق کر کے ان کا حل تلاش کرنا ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کسی قسم کی کوئی تحقیق یا اکٹھی کی گئی معلومات ایسی نہیں جن سے مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہو۔

(الف) مقامی اداروں پر اس قدر تیزی سے آنے والے زوال کی وجوہات اور اس زوال کو کس طرح روکا جائے۔

(ب) حکومت کی انتظامی قابلیت اور اس سے معیشت و سیاست پر مرتب ہونے والے اثرات

(ج) کیا ناکافی اور بعض حالات میں پرانی وضع کے قانون اور ریگولیٹری نظام معیشت اور معاشرے کو انصاف فراہم کر سکتے ہیں؟

(د) حکومت کی شہریوں کی جان و مال کی حفاظت میں ناکامی اور اس کے معیشت، سرمایہ کاری، سرمائے کا بیرون ملک اخراج اور باہر سے آنے والی سرمایہ کاری پر کیا اثرات پڑتے ہیں۔

(ر) معاشی و سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں اور خاص طور پر پبلک سیکٹر کے انتظامی

معاملات میں بہتری پیدا کرنے پر کیسے زور دیا جائے؟

اپنی معیشت کے ڈھانچے سے متعلق ان مسائل پر غور کئے بغیر کسی بھی شعبے میں اور خاص طور پر رائج الوقت شعبوں مثلاً ''آلودگی'' وغیرہ میں بہتری کی قطعاً توقع نہیں کی جاسکتی۔ جب بھی ہم پالیسی وضع کرنے لگتے ہیں تو ہمیں پالیسی کے نفاذ کی اہمیت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے اور پالیسیوں کے نفاذ کا انحصار حکومتی انتظامیہ کی قابلیت پر ہوتا ہے۔ اس لئے عوام کے لئے کسی قسم کی پالیسی وضع کرتے ہوئے یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہئے کہ یہ پالیسی قابل عمل بھی ہو۔ اور یہ حقیقت نظروں سے قطعاً اوجھل نہ ہونے پائے کہ ہماری ترقیاتی حکمت عملی کا اہم ترین حصہ یہ ہونا چاہئے کہ کسی پالیسی کو عملی طور پر ہم کتنی خوش اسلوبی سے نافذ کرسکتے ہیں۔

ڈونرز اور برین ڈرین

اب جبکہ ڈونرز باہر کی پیشہ ورانہ منڈی سے زائد اور بچے کھچے ماہرین کو پاکستان میں بلا کر کام پر لگاتے ہیں اور پاکستان کے بہت سے اعلیٰ دماغ ہر دم ملک چھوڑنے کی فکر میں ہوتے ہیں یا پہلے سے ہی باہر زندگی کے دن بتا رہے ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو ہم ''برین ڈرین'' کی اصطلاح عام طور پر استعمال کرتے تھے لیکن آجکل جب کہ ڈونرز کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے یہ اصطلاح متروک سی ہوکر رہ گئی ہے اور آپ کو جتنے پاکستانی پیشہ ور ماہرین بیرون ملک کام کرتے نظر آئیں گے ان میں سے آرام کے ساتھ کوئی بھی نہیں رہ رہا ہے۔

جونہی ہمارے ہاں سے اعلیٰ پائے کے اور اچھے تربیت یافتہ ماہر ملک چھوڑ جاتے ہیں تو ڈونرز ان کی جگہوں پر غیر ملکی ماہرین لگوا دیتے ہیں۔ اس طرح سے وہ ماہرین جنہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا اور جن میں کوئی لگن یا جذبہ نہیں ہوتا ان ماہرین کی جگہ لے لیتے ہیں جنہیں نہ صرف مقامی حالات کا بہت زیادہ پتہ ہوتا ہے بلکہ ان میں کام کرنے اور حالات کو سدھارنے کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ملک میں دانشورانہ اور علمی سرگرمیوں کو حوصلہ دینے اور ان کو جلا بخشنے کے دو طریقے ہوتے ہیں یا تو ڈونرز کی طرف سے مہیا کردہ رقم سے ماہرین علم وفن کو کام کرنے کے موقع میسر آتے ہیں یا پھر حکومتی پیسے کے ذریعے سے! ان دونوں طریقوں سے اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ پاکستانی ماہرین کو کام کا موقع نہ دیا جائے خواہ وہ ڈاکٹر عبدالسلام جیسا نوبیل پرائز یافتہ شخص ہی کیوں نہ ہو۔ ڈونرز اور حکومت دونوں کے قوانین ایسے ہوتے ہیں جن کے تحت غیر ملکیوں کو زیادہ معاوضہ دیا جاتا ہے جبکہ پاکستانی ماہرین کو ادا کیا جانے والا معاوضہ مقابلتاً بہت کم ہوتا ہے بیشک

پاکستانی ماہرین قابلیت کو ادا کیا جانے والا معاوضہ مقابلتاً بہت کم ہوتا ہے بیشک پاکستانی ماہرین قابلیت اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بہت بہتر ہی کیوں نہ ہوں۔ایسے قوانین بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ پاکستانی ماہر غیر ملکیوں کی زیر سرپرستی کام کرتا ہے اور انہی کو جوابدہ بھی ہوتا ہے۔

پھر بھی یہ امید کی جاسکتی ہے کہ حکومت اور ڈونرز کوئی درمیانی راہ نکال سکیں جس سے ڈونرز کی اپنے پسندیدہ ماہرین کو نوکری دینے میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اور حکومت کے لئے بھی برین ڈرین (Brain Drain) کی استرداد کا امکان باقی رہے۔ اور اگر برین ڈرین کی استرداد کو پاکستان میں موجود اداروں سے منسلک کر دیا جائے تو شاید ہمیں درپیش مسائل کا دیرپا حل ڈھونڈا جا سکے۔اگر ہم ان مسائل سے نبرد آزما ہونا چاہتے ہیں جن کا حل نہ صرف پاکستان بلکہ اس کے بہتر مستقبل کے لئے بیحد ضروری ہے تو ہمیں اپنے بہترین دماغوں کو یہ کام سونپنا ہوگا کہ ہمارے لئے تحقیقی ایجنڈا وہ ترتیب دیں۔

(5)

چٹکلے چلتے ہیں

مشیران ڈونرز اور منصوبہ بندی کمیشنوں کے دفاتر کے مسلسل چکر لگاتے ہیں یہ لوگ این جی اوز کے مالکان ہوتے ہیں اور اپنی گفتگو میں بے معنی اصطلاحات کا استعمال بہت تواتر کے ساتھ کرتے ہیں جیسے ''اشتراک'' ''قومیت'' ''حصول طاقت'' ''ایم اینڈ آر'' ''آر ایف پی'' ''ایس اے پی'' ''اے کے آر ایس پی'' ''او پی پی'' وغیرہ۔ امریکہ کا عام آدمی ایسے افراد سے کافی متاثر ہو جاتا ہے جو اس قدر فصاحت و بلاغت اور موٹی موٹی اصطلاحات کا اپنی گفتگو میں بیجا استعمال کرنے پر قدرت رکھتا ہو اور تکنیکی زبان میں ترقیاتی امور پر چرب زبانی کا انبار لگانا جانتا ہو۔ اور جب ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کوئی صاحب کسی تنظیم میں کام کرتے ہیں تو ہم ان کے دبدبے میں آجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم جیسے معمولی تعلیم رکھنے والے لوگ ایسے صاحب مرتبہ شخص سے کیونکر بات کر سکتے ہیں جو آئی بی آر ڈی، یو این، یو این یو، آئی ایل او، جی اے ٹی ٹی، یو این سی ٹی اے ڈی، یو این ڈی پی، اے ڈی بی وغیرہ جیسی تنظیموں سے وابستہ ہوں۔ پھر ہم اپنے تخیل میں اسی کی عظمت کے قائل ہونے لگتے ہیں اور دل ہی دل میں کہتے ہیں اوہ خدا۔ یہ شخص تو بین الاقوامی امور کے بارے میں کس قدر باخبر ہے۔ اور یہ تو وسیع المطالعہ فلاسفر لگتا ہے۔ یہ یقیناً بین الاقوامی سطح پر قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہوگا۔ اور دنیا کی تمام بڑی بڑی ایجنسیاں اس شخص کی طالب ہونگی۔

پچھلی مرتبہ جب میں پاکستان آیا تو ''پاکستان میں معاشی ترقی اور معاشی پالیسی'' پر ایک عمدگی کے ساتھ منظّم کئے گئے سیمینار میں شرکت کرنے کا مجھے موقع ملا۔ اس سیمینار کے دوران مجھے

بہت سے مشیروں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ ڈونر ایجنسیوں نے سیمینار کے لئے بیشتر کافی پڑھے لکھے اور نامی گرامی ماہرین معیشت کو جمع کر رکھا تھا اس سیمینار کا افتتاح وزیر خزانہ نے کیا اور اس سیمینار کے ہر سیشن کی صدارت کسی نہ کسی وفاقی وزیر نے کی۔ چونکہ وہاں اہم شخصیات کی اتنی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی کہ سٹیج پر اضافی کرسیوں کا بندوبست کرنا پڑا تا کہ ان اہم شخصیات کو وہاں بیٹھایا جا سکے صرف یہی نہیں بلکہ ان کے لئے رسمی عہدہ بھی وضع کرنا پڑا مثلاً چیئرمین وغیرہ۔ ان اہم شخصیات کو پذیرائی بخشنے کے لئے کئی مرتبہ سیمینار کی کارروائی کو روک کر استقبالیہ خطابات دیئے جاتے تھے جو کسی بھی ذی ہوش کو کافی گراں گذرتے تھے۔ اس سیمینار کو ٹیلی وژن اور اخبارات کے ذریعے سے اچھی خاصی تشہیر ہوئی اور منتظمین کے لئے یہ بات از حد مسرت کا باعث تھی۔ غالباً سیمینار کا یہی مقصد تھا کہ منتظمین۔ مشیران اور دیگر لوگوں کو جو اس سیمینار سے متلق تھے ان کی خوب تشہیر ہو۔ سیاستدانوں اور نوکر شاہی کے لئے یہ اچھے مستقبل کا امین بنا اور مشیران کے لئے نئے معاہدوں کا پیشہ خیمہ!

ابتداء میں تو مجھ پر لرزہ طاری ہوا لیکن مجھے امید تھی کہ اس سیمینار سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ آخر میں ان لوگوں کے درمیان موجود تھا جو گفتار کے دھنی تھے۔ بہت پڑھے لکھے تھے اور ڈوونرز اور بین الاقوامی ایجنسیوں کے لئے بہت اہمیت رکھتے تھے اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ حضرات فصاحت و بلاغت میں یکتا تھے اور بہت متاثر کن بھی۔ ان سے مجھے مزیدار قصے۔ شاعری۔ اصطلاحات۔ خوبصورت انداز بیان سے مرصع تجاویز سننے کا موقع ملا لیکن میرا مجموعی تاثر یہ تھا کہ سیمینار میں ہونے والی گفتگو عامیانہ اور فرسودہ باتوں پر مبنی تھی نہ تو وہ مسائل جو موضوع سخن تھے ان پر تحقیق کی گئی تھی نہ ہی کسی قسم کی شہادتیں پیش کی گئیں نئے نظریات یا مفروضوں سے قطعاً صرف نظر کیا گیا۔ کوئی بحث و مباحثہ بھی نہ ہوا۔ صرف یہ کہ تقریروں کا ایک سلسلہ تھا جو جاری رہا۔ لیکن تمام منتظمیں اس سے بڑے مسرور و شاداں تھے کیونکہ ان کی تصاویر اور نام اخبارات کی زینت بن رہے تھے جو ان کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے مفید ثابت ہو سکتے تھے۔

میرے لئے یہ بات نہایت ہی حیرانی کا باعث تھی کیونکہ وہ ماہرین علم و دانش مشیران یا مقررین جو بے پایاں اہمیت کے مستحق قرار پائے تھے انہوں نے اپنی تقاریر کے دوران محتاط طریق پر کی جانے والی تحقیق یا موضوع سے متعلق جدید ترین معلومات کو زیر بحث لانا گوارا ہی نہ کیا۔ مثلاً جو بھی مقالہ جات پڑھے گئے ان سے قطعاً اندازہ نہ ہوتا تھا کہ مقالہ نگار کو اس موضوع سے کسی قسم کی کوئی واقفیت ہے جس سے متعلق وہ بول رہے ہیں۔ بہت سے مقالہ نگاروں نے تو حوالہ جات دینے کی

زحمت ہی گوارا نہ کی اور اگر کسی نے ایک آدھ حوالہ دیا بھی تو حکومتی ذریعے سے یا اپنے کسی سابقہ مقالے سے جو کم وبیش اسی موضوع پر تھا جو اس سیمینار میں موصوف پڑھ رہے تھے۔

سیمینار میں کسی قسم کی بحث ومباحثہ نہ ہوا۔ مقررین کی طولانی تقاریر کے بعد سوالات وغیرہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی اور نہ ہی وہ مواد جو تقاریر کے دوران استعمال کیا گیا اسے موضوع بحث بنایا گیا۔ اس سیمینار کے شرکاء نے اس صبح اپنی اپنی تقاریر تیار کی تھیں اور لگتا تھا کہ وہ اپنی تیار شدہ تقاریر کو مکمل کرنے پر پوری طرف سے کمر بستہ ہیں۔ خواہ ان تقاریر کا موضوع سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ جلد ہی میں یہ محسوس کرنے لگا کہ جیسے حقائق اور شہادتوں کی بجائے مقررین قصے کہانیوں پر انحصار کر رہے ہیں۔ ان شعلہ بیان مقررین میں سے بیشتر ایسے بھی تھے جنہوں نے روزانہ کاروائی کے بارے میں بانٹے گئے صفحات بھی نہ پڑھے تھے۔ ان حضرات میں سے کسی ایک نے بھی ان صفحات پر نظر نہ دوڑائی تھی ان کے بارے میں سوچنا یا ان پر بحث کرنا تو دور کی بات تھی۔

دوسروں کے دلائل کو اپنے مقالوں میں بے تکلفی سے استعمال کر کے ہمارے مشیران کرام نے علمی دیانتی سے اپنے آپ کو آزاد کروالیا۔ اور جب کسی نے اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ دلیل تو فلاں ذریعے میں پہلے سے دی جا چکی ہے تو مشیر صاحب نے نہایت ڈھٹائی سے اس اشارے کو پس پشت ڈالتے ہوئے کہا ''میں نے اس پر پہلے سے سوچ رکھا تھا البتہ مجھے آج سے پہلے اس کا اظہار کرنے کے لئے وقت نہیں ملا'' چنانچہ دانشورانہ حقوق ملکیت کو تسلیم کرنے کی ضرورت قطعاً محسوس نہ کی گئی۔

دنیا کے نظام کو سمجھنے کے لئے بہت سنجیدہ علمی کاوشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ دنیا میں کارفرما کسی بھی عمل کی مکمل تشریح ممکن نہیں۔ پھر بھی مختلف نظریے اور نمونے تشکیل دیئے جاتے ہیں تاکہ زیر بحث عمل کو کسی نہ کسی طرح سے سمجھا جا سکے۔ چنانچہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایسے نمونہ جات اور نظریے وجود میں لائے جاتے ہیں تاکہ حقیقت کو سمجھا جا سکے۔ کسی بھی ماہر علم ونصاب کے لئے مشکل ترین یہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں اسے جدید ترین نظریات سے اپنے آپ کو باخبر رکھنا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ نظریات بہت تیزی سے تبدیل ہو رہے ہوتے ہیں ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کام پر لگے ہوتے ہیں وہ نہایت تندہی سے نئے نئے نظریات کو خلق کرتے ہیں۔ ماہرین علم کے لئے یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے تحقیقی مقالوں سے واقفیت پیدا کریں اس سے پہلے کہ وہ جرائد میں چھپ جائیں۔ اس ضمن میں جو پہلی دلیل ہمارے

دانشور دیتے ہیں وہ یہی ہوتی ہے کہ دوسرے ممالک کے ماہرین کے نظریات ہمارے ملک کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہمارے دانشور۔مقرر یا مشیران اپنی تقاریر میں اس جستجو کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ دنیا کو کسی بھی نظریئے کی عینک سے نہ تو دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اس کے ذریعے سے سمجھنا چاہتے ہیں بلکہ دنیا حقیقت میں جس طرح سے ہے اسے اسی طرح سے سمجھنے کی سعی کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔اور یہ نظریات جو بیرون ملک کے ماہر گھڑ لیتے ہیں وہ ہمارے کسی کام کے نہیں۔ ہمیں بالکل نئی مقامی اور کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کی جڑیں ہمارے معاشرے میں پیوست ہوں۔

بے شک اس طرح کی دلیل دینا بہت آسان ہے۔اب ماہر علم۔مشیر یا مقرر ہر طرح کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔اب نہ تو اسے کسی قسم کے علم سے واقفیت رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ بین الاقوامی نظریات اور تھیوریوں کو رد کرنے کے بعد کوئی ایسا ذریعہ علم نہیں ہوتا جس سے وہ کچھ سیکھیں یا جس کا انہیں مطالعہ کرنا پڑے اور نہ ہی اسے کسی قسم کی تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس لئے مقالوں میں حوالے دینا بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔اور دانشور۔مقرر محض یہ کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں ''مقامی ہے لہذا پاکستانی ہے۔''

یہ ''مقامی اور پاکستانی'' طرز استدلال کا اضافی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے اچھائی اور برائی میں اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔اگر ایک دفعہ یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تب صرف ان مشیروں کے افکار کا جائزہ محدود پیمانے پر ہی لیا جا سکے گا اس طرح سے وہ بیرونی دنیائے علم و فضل سے چھٹکارہ پا کر اپنی علیحدہ دکان سجانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اب اس قابل بھی ہو جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں سے جو کہ بین الاقوامی معیار کے دانشور ہیں ان سے برتر ثابت کروالیں۔

سب سے اہم بات یہی تھی کہ دانشور۔مقرر۔مشیر کی تقریر یا مشاورتی رپورٹ کی کوئی نظریاتی حد بندی (Theoretical framework) ہی نہ تھی کیونکہ ان کے مطابق کوئی نظریہ ہمارے لئے سودمند نہیں۔یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ نظریاتی امکانات یا تجرباتی اصول کون سے ہیں جو دوسرے ماہرین نے بہت محنت کے بعد مرتب کئے ہیں شرکائے محفل نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی طویل اور زور بیان کی چاشنی سے بھرپور تقاریر میں سینکڑوں سفارشات پیش کر دیں۔وہ واقعتاً کسی قسم کے موضوعاتی یا نظریاتی نظم و ضبط کی قید سے پوری طرح آزاد تھے۔ان کے لئے انحصار کرنے کے لئے صرف ان کے اپنے افکار تھے اور اعداد و شمار کی بجائے قصے کہانیاں سنا دینا انہیں

زیادہ بہتر لگتا تھا۔اس طرح کی باتیں ''یہ میں نے اس گاؤں میں قیام کرتے وقت مشاہدہ کیا'' میں نے اے کے آر ایس پی کے،لوگوں سے بات کی'' میرے دوست اشوک بھابھانی نے کہا'' ''اختر حمید خان نے کہا'' وغیرہ وغیرہ عام طور پر سننے میں آتی تھیں۔ایسے چٹکلوں کی بنیاد پر بڑے بڑے تجربی فیصلے کرنا ہمیں بہت مہنگا پڑتا ہے لیکن ہم ہوتے کون ہیں؟ مشیران کا تو نظریہ ہی یہ ہوتا ہے کہ ''چٹکلے ہونگے تو چلیں گے'' اور یہ خاصا منافع بخش کاروبار ہے۔ بہت سے افراد بڑی محدود تعلیمی اور علمی صلاحیتوں کے باوجود چٹکلے سنا سنا کر دولتمند ہوتے جارہے ہیں۔

II۔ ماہرین معیشت، معاشی پالیسی اور حکومت پر انحصار

(6)

نئے ڈاکٹر

ہماری تاریخ کی ہر دہائی کے دوران ہمیں ایک معروف، گفتگو کے دھنی اور سوچ کی گہرائی رکھنے والے ''رہائشی ڈاکٹر'' کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ ہمارے ہاں معاشیات کے میدان میں سوچ بچار کرنے کی زیادہ تر ذمہ داری انہی ڈاکٹروں کے سر رہی ہے جو اپنے نظریات کو فروخت کرنے میں مہارت نامہ رکھتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی کے دوران جب ایوب خان کی حکومت تھی تو حقیقی ڈاکٹر کا ظہور ہوا یہ صاحب محبوب الحق تھے۔ بعدازاں بھٹو صاحب کا دور آیا تو ایک اور ڈاکٹر ہماری معیشت کو سدھارنے کے لئے آن دھمکے یہ مبشر حسن تھے۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کا دور آیا تو پرانے ڈاکٹر صاحب (محبوب الحق) کی خدمات پھر سے حاصل کر لی گئیں۔ حالیہ عہد میں کئی ایک ڈاکٹر ''رہائشی ڈاکٹر'' کی پوزیشن سنبھالنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اگرچہ ان ڈاکٹروں کا اتنا اثر ورسوخ نہیں جتنا سابقہ ڈاکٹروں کا تھا اور انہیں کوئی عہدہ بھی نہیں دیا گیا لیکن یہ حضرات اپنے پیش روؤں ہی کی طرح گفتگو کے ماہر اور پالیسی کے ہر پہلو سے متعلق اپنی رائے دینے میں بہت تیز ہیں۔

یہ جان کر یقین میں پختگی آتی ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر بدل گئے ہیں۔ لیکن صرف ان کے ظاہر ہی بدلے ہیں اس سے زیادہ کوئی تبدیلی نہیں آسکی۔ نئے ڈاکٹر ابھی تک سست روی سے آگے بڑھنے پر یقین رکھتے ہیں اور سرکاری سرپرستی ان کو سدا مرغوب رہتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے تئیں ان غیر ملکی اثرات کا بھی مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے باعث ہمارے ملک کی ترقی میں رکاوٹ حائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہمارے ہاں ایسے ''معاشیات کے ماہرین'' (Econolords) موجود ہیں جن کی وجہ سے معاشی شعور اور عقل ابھی باقی ہے۔

اپنے پیش روؤں کی طرح نئے ڈاکٹر بھی حکومت کے اضافی کردار کے بڑے حامی ہیں وہ

بھی غریبوں کے چیمپئن ہیں۔ سابقہ ڈاکٹروں کی طرح یہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ غریبوں کی سب سے بڑی سرپرست اور خیرخواہ حکومت ہی ہے۔ چنانچہ ہر شعبے میں اس کی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا جانا چاہئے۔ ان کی دانست میں حکومت نہ تو وسائل کو ضائع کر سکتی ہے نہ ہی وہ نا اہل ہو سکتی ہے اور اس کے پاس اس قدر وسائل ہوتے ہیں کہ اسے غریبوں پر مزید ٹیکس لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یہ ڈاکٹر محسوس کرتے ہیں کہ مخصوص مفادات رکھنے والے عناصر جن کا حکومت پر کنٹرول ہوتا ہے اور جنہوں نے ان ڈاکٹروں کو ملازمت دے رکھی ہوتی ہے کا فائدہ تبھی ممکن ہے اگر حکومت کا کردار مزید بڑھا دیا جائے۔ اگرچہ حکومت کا بنیادی کام تو مخصوص مفادات رکھنے والے عناصر کی جھولی بھرنا ہے لیکن حکومت ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو غریبوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے اقدامات کر سکتی ہے۔ اور ملک کو ساری دنیا میں جاری سخت مقابلے سے بھی بچانے کا مشورہ بھی یہی ڈاکٹر صاحبان دیتے ہیں۔ حکومت بیشک اگر کرپٹ اور نا اہل بھی ہو تو بھی ان کے نزدیک لوگوں کی حفاظت اور بھلائی کے لئے ہر شعبے میں اس کا دخل بہت ضروری ہے۔ ہمارے نوآبادیاتی آقاؤں نے ہمیں یہی بتایا ہے کہ منڈی کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی۔

معاشیات کے ماہرین کا جو ہم لوگوں پر احسان ہے اسے تسلیم کرنے اور نئے ڈاکٹروں کا صحیح پس منظر جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ڈاکٹروں کی روایات کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔

پہلا ڈاکٹر ایسے نظریات اور تھیوریاں پیش کرنے کا ماہر تھا جن کے تحت حکومت کے اضافی کنٹرول کو یقینی بنایا جا سکے اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ہی ایسی منصوبہ بندی کے حامی کی حیثیت سے کیا جس سے معیشت کی چابی حکومت کے ہاتھ میں رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے کردار میں اضافہ ہوتا رہے۔ اپنے اور اپنے ماتحت نوکر شاہی کے زیر کنٹرول منضبط معیشت (Regulated economy) سے بھی اسے اطمینان نہ ہوا تو اس نے اجارہ دارانہ صورت اختیار کرتے ہوئے پرائیویٹ سیکٹر کی مزمت کرنی شروع کی اور نیشنلائزیشن کے لئے ذہنی و علمی بنیاد فراہم کی اور حکومت کے کردار میں مزید اضافے کے لئے راہ ہموار کی۔

انہی دنوں دوسرے ڈاکٹر نے پہلے کی جگہ لی جنہوں نے پرائیویٹ سیکٹر اور بائیس خاندانوں کے خلاف تند و تیز مہم شروع کر رکھی تھی۔ ان کے جانشین نے تسلسل کو جاری رکھا اور اس مہم میں مزید سخت گیری پیدا کی۔ اس مرحلہ پر حکومتی کردار میں اضافہ تبھی ممکن تھا اگر پیداواری عمل میں حکومت براہ راست شریک ہو جائے چنانچہ یہ ایک بھرپور عمل تھا جس میں پرائیویٹ سیکٹر پر تنقید کے

تابڑتوڑحملوں کا ازسرنو آغاز کیا گیا۔نہایت ہی غیرمحتاط طریقے پر نیشلائزیشن کا یہ اندازہ کئے بغیر ہی آغاز کر دیا گیا کہ آیا حکومت قومی ملکیت میں لئے گئے اداروں کو کامیابی سے چلا بھی سکے گی یا نہیں۔ لیکن ''نزیشن کے نتیجے میں حکومت کے اس قدر وسیع کردار پر بھی ڈاکٹر صاحب کو اطمینان نہ ہوا تو انہوں نے پبلک سیکٹر کا دائرہ کار بڑھانے کا ایک اور منصوبہ تجویز کیا۔اس نے دیکھا کہ پبلک سیکٹر کے تحت مختلف کارپوریشنوں کی تشکیل مشکل کام نہیں۔ چنانچہ پبلک سیکٹر حدود میں وسعت کا دارومدار حکومت کے تخیل پر تھا۔اس قسم کے منصوبہ سے ایک اور فائدہ یہ بھی ہوا کہ حکومت کی سرپرستی کی سرحدیں بڑھ گئیں اب وہ کافی ساری بااثر شخصیات کو یہ کارپوریشنیں جاگیروں کی طرح عطا کر کے زیراحسان کرسکتی تھی بالکل اسی طرح جیسے نوآبادیاتی دور میں ہوتا تھا۔اس سکیم کا اثر فوری طور پر دیکھنے میں آیا۔ پبلک سیکٹر کے تحت قائم ہونے والی یہ کارپوریشنیں تعداد میں اس طرح بڑھیں جس طرح خرگوشوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

جب 1977ء میں ضیاء الحق کا مارشل لاء لگا تو فوجی حکومت کے پرانے ساتھی ''پہلے ڈاکٹر'' کی خدمات دوبارہ سے حاصل کر لی گئیں۔اب ان ڈاکٹر صاحب (محبوب الحق) کو اس بات کا احساس تھا کہ حکومت کے کردار میں مزید اضافہ کرتے رہنے کے لئے اب نئے دلائل کی ضرورت ہے چنانچہ جدت پسند ڈاکٹر نے نئے نظریات پیش کرنے کی ٹھانی۔اب ان کا دل غریبوں کے لئے خون کے آنسو رونے لگا۔اور اس میں شک بھی نہیں کہ غریبوں کو بہت ہی عرصے تک ان کے معاشی حقوق سے محروم رکھا گیا اور اب غربت کو ختم کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔اب حکومت کو اپنے اس فرض کا بھی احساس شدت سے ہونے لگا کہ اسے غریبوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔اس نیک دل ڈاکٹر نے اس طرح سے حکومت کے لئے ایک اور بہانہ ڈھونڈ لیا جس کو بنیاد بنا کر اسے اپنا دائرہ عمل بڑھانے میں کوئی مسئلہ پیش نہ آیا۔تمام تر نااہلی اور مسائل کے انبار کے باوجود حکومت نے اس ''نیک مقصد'' کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر وسعت دی۔

اس شاندار روایت پر عمل کرتے ہوئے نئے ڈاکٹر بھی اپنے آپ کو ''معاشیات کے مرد میدان'' ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں اسی کوشش میں وہ حکومتی کردار میں اضافے کو ممکن بنانے کے مزید اور نئے نئے طریقے دریافت کر کے ہمیں حیران کر دیتے ہیں۔اس کے باوجود کہ کیمونزم کا خاتمہ ہو چکا ہے اور دنیا بھر میں حکومت کے سائز اور مداخلت کے پیمانے میں بہت حد تک کمی واقع ہو چکی ہے لیکن نئے ڈاکٹر پھر بھی حکومت کے سائز کو بڑھانے کے لئے مضبوط دلائل دینے

کی کوشش کرتے ہیں اس ضمن میں دو تین نکات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں مثلاً بنیادی وسائل (Infrastructure) کی طرف توجہ دینے میں ہماری غفلت، آبادی میں اضافہ اور بے ترتیب شہری ترقی وغیرہ یعنی ان مسائل کی موجودگی میں حکومت کے حجم اور دائرہ عمل میں اضافے کی شدید ضرورت پر زور دیا جاتا ہے اور جو کوئی بھی حکومت کے سائز میں کمی کرنے کو کہتا ہے نئے ڈاکٹر اس پر بری طرح سے حملہ آور ہوتے ہیں۔

ایک اور چیز جس سے وہ ہمیں آگاہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں وہ ''نوے کی دہائی کے لئے لائحہ عمل'' ہے اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ''ہمارے مسائل کا حل بھاری صنعتوں، الیکٹرونکس، بھاری انجینئرنگ اور کیمیاوی صنعتوں کے قیام میں مضمر ہے۔ لیکن ان صنعتوں کے قیام کے لئے سرمائے کی فراہمی صرف حکومت ہی کے بس میں ہے لہذا یہ سب کام حکومت کو ہی کرنا چاہئے یعنی اخراجات میں اضافہ اور ایسے قوانین جن سے صنعتوں کے قیام میں مدد مل سکے مگر اس سوال کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا کہ ''معاشیات کے ماہرین'' کی نئی ترقیاتی حکمت عملی ایسے ملک میں کیسے عملی صورت اختیار کرے گی جہاں بین الاقوامی اور نجی دونوں طرح کے قرضوں کے لئے صورتحال موافق نہیں ہے۔

پرائیویٹ سیکٹر سے متعلق اپنے شکوک کی بنا پر ان ''معاشیات کے ماہرین'' نے ایک نیا انداز فکر و نظر کو روشناس کروایا ہے جسے ''شراکت'' (Participation) کا نام دیا گیا جس کے تحت وہ مسیحا کا کردار ادا کریں گے جسے اصطلاحاً اینی میٹر (animater) کہتے ہیں۔ ان ماہرین معاشیات کو حکومت اور ڈونر بھاری معاوضے دے کر یہ ذمہ داری سونپیں گے کہ وہ ''شراکت'' کی تھیوری کے بارے میں رشد و ہدایت فراہم کر سکیں گے۔ شراکت کو ممکن بنانے کے لئے این جی او تنظیمیں قائم کی جائیں گی جن پر ان حضرات کا کلی اختیار ہوگا۔ ایک اور سوال یہ ہے کہ ان ''غیر حکومتی تنظیموں'' میں حکومت کی عدم موجودگی ہے یا نہیں۔ یہ پوری طرح سے واضح نہیں ہو سکا۔ یہ تنظیمیں نہ تو کسی کو جوابدہ ہیں نہ ان پر پوری توجہ دی جاتی ہے اور نہ یہ حکومتی ایجنسیوں کی طرح سرکاری پیسے پر ہی انحصار کرتی ہیں۔

چنانچہ اس طرح سے معاشیات کے ماہرین حکومت کے دائرہ عمل کو وسیع تر کرنے میں پوری طرح سے مصروف ہیں۔ حتی کہ حکومت اب بدانتظامی کی حد تک پھیل چکی ہے لیکن نئے ڈاکٹر صاحبان اپنے پیش روؤں کی طرح اس کے عمل کی سرحدوں کو کشادہ بنانے کے لئے نئے سے نئے

دلائل ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ حالانکہ حکومتی قرضہ نا قابل بیان حد تک بڑھ چکا ہے پھر بھی یہ حضرات حکومت کے خسارے کو کم کرنے کی بجائے اسے مزید بڑھانے پر مصر رہتے ہیں۔ اس ضمن میں حکومتی وسائل کو ضائع کرنے میں حکومت کی پیاس کی بھی کوئی حد نہیں۔ اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ سات عظیم تر منصوبوں پر کاغذی کارروائیاں کی گئیں ان پر بھاری رقوم خرچ ہوئیں ان منصوبوں سے انہوں نے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھیں تھیں۔ ان تمام تر توقعات اور اخراجات کے باجود ان منصوبوں پر عمل نہ ہو سکا۔ یہ بھی کسی کے لئے اہمیت نہیں رکھتا کہ پاکستان میں اتنی بڑی بیوروکریسی نہایت ہی نااہل ہے جو ہر سمت میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہتی ہے اور خودمختار ادارے وسائل کو ہڑپ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔ لیکن حکومت کی بڑھتی ہوئی وسعتیں اب تو عقیدے کی شکل اختیار کر چکی ہیں اور ہم صرف ان ڈاکٹروں اور حکومت کے لئے خدا کا شکر ہی ادا کر سکتے ہیں۔

(7)

حکومت اور فراہمی روزگار

پاکستان کی معیشت کو کئی چیلنجوں کا سامنا ہے جن میں سب سے نمایاں بڑھتی ہوئی آبادی کی موجودگی میں ملک کی معاشی بہتری میں اضافہ کرنا ہے۔ ہماری آزادی کے بعد اکثر برسوں کے دوران ہماری آبادی میں اضافے کی شرح 3 فیصد سالانہ رہی ہے۔ اس شرح کے ساتھ ہمارا ملک دنیا کے ان ممالک کی صف میں شامل ہو گیا ہے جہاں آبادی بڑھنے کی رفتار تیز ترین ہے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ملک جہاں آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہو وہاں ترقی کی رفتار ان ملکوں سے کہیں تیز ہونی چاہئے جہاں آبادی کے بڑھنے کا تناسب کافی کم ہے اور جب تک یہ نہیں ہو پاتا شہریوں کی بہتری ممکن نہیں اور اس کے ساتھ ہی بے روزگاری میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ مسئلہ بہت ہی سادہ سی نوعیت کا ہے اس میں معاشیات کے کسی گنجلک گتھیوں کو سلجھانے کی ضرورت نہیں۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟ یہ بہت ہی اہم سوال ہے جس کے لئے ہمارے بہترین معاشیات دانوں کی توجہ درکار ہے اور مجھے ذاتی طور پر اس وقت بہت مایوسی ہوتی ہے جب بہت سے قابل صد احترام حضرات یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں ''معاشی ترقی کی رفتار بڑھاؤ'' ''آبادی میں اضافے کو کم کرو'' ''روزگار کے مواقع بڑھانے کے لئے براہ راست پالیسیوں کو اپناؤ۔'' حالانکہ جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا پیرے میں بتانے کی کوشش کی سیدھا سادھا حساب کا مسئلہ ہے اور ''اگر خواہشات گھوڑوں کی طرح ہوتیں تو گداگر ہی ان پر سواری کرتے۔''

تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی بیروزگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہمارے ترقی پسند مفکر (Dots) اپنی خواہشات کی طویل فہرست پیش کر دیتے ہیں جس میں معاشی ترقی کی رفتار میں اضافہ اور دیہی عوام کو روزگار کی فراہمی وغیرہ عام طور پر اہم نکات

ہوتے ہیں (میں ان حضرات کو (ڈی او ٹی) اس لئے کہتا ہوں کہ اس ملک میں جو کوئی بھی لکھنے یا بولنے کے قابل ہو وہ معیشت پر کھلے عام رائے زنی کرنا اپنا حق سمجھتا ہے) یہ ترقی پسند مفکر (Dots) ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ یہ مسائل حل کیسے ہونگے؟ وہ صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اگر ایسا ہو جائے تو ہمارے معاشی مسائل مثلاً بیروزگاری وغیرہ حل ہو جائیں گے۔ چنانچہ مباحثے، سیمینار یا تحقیقی مقالہ جات جو سیمناروں وغیرہ میں پڑھے جاتے ہیں ان میں بہت کم نئی اور قابل عمل تجاویز ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر قومی افرادی قوت کا کمیشن حکومت پر ''ایک مؤثر اور پرزور قسم کا آبادی اور روزگار سے متعلق پروگرام'' شروع کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ پاکستان میں معاشیات سے متعلق تحریروں میں اکثر اس طرح کی خواہشیں ملتی ہیں۔ یہ فاضل افراد کسی ایسے جامع پروگرام کو شروع کرنے پر زور دیتے ہیں جس سے آبادی میں اضافے کے مسئلے کا معجزاتی حل سامنے آجائے۔ ایسا کہتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ چند سال پہلے حکومت نے اپنی طرف سے وہ پروگرام نافذ کیا تھا جس کی سفارش انہی جیسے اصحاب نے کی تھی۔ اس پروگرام کو نافذ کرنے میں بہت سے وسائل تو صرف ہوئے لیکن نتائج کے اعتبار سے اس کی کامیابیاں انتہائی محدود تھیں۔

اگر قومی کمیشن برائے افرادی قوت کی دس سفارشات پر غور کیا جائے جو اس نے آبادی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے پیش کی تھیں تو ان میں نہایت ہی پرمغز تجاویز شامل تھیں مثلاً معاشی ترقی میں اضافہ کرنا، دیہی عوام کے روزگار میں اضافہ کرنا، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی اور پڑھے لکھوں میں بیروزگاری کا خاتمہ کرنا وغیرہ۔ اس کمیشن میں کئی ایک اعلیٰ اختیاراتی اور کافی رقم کے عوض مہیا کئے گئے معیشت دان شامل تھے جنہوں نے ٹیکس دہندگان سے حاصل کیا ہوا پیسہ محض الفاظ کی تکرار اور ایک ہی دلیل کو مختلف انداز میں پیش کرتے رہنے پر ضائع کر دیا۔ شاید وہ ہم لوگوں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ ان کی الفاظ کے ہیر پھیر سے بھری ہوئی 1000 صفحات کی رپورٹ کو پڑھ کر اس میں سے پالیسی مرتب کر لیں۔

ہمارے ہاں کے ترقی پسند مفکرین (Dots) ساٹھ کی دہائی کے دوران ہونے والی ترقی کو اعتماد کی نظر سے نہیں دیکھتے اور نہ ہی ''ٹریکل ڈاون'' (Trickle down) اور ''نیوٹریکل ڈاؤن'' (Neo Trickle down'' جیسی اصطلاحات پر یقین رکھتے ہیں۔ (یہ دونوں طرح کی اصطلاحات ہمیں متاثر کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں لیکن ان دونوں کے معانی میں کیا فرق ہے؟ یہ مشکل سوال ہے)۔ ترقی پسند مفکرین (Dots) کو ستر کی دہائی زیادہ پسند ہے کیونکہ ان

سالوں کے دوران عوامی جوش و کروش بھی تھا اور حکومت کے دائرہ عمل میں بھی بوجہ نیشنلائزیشن بہت زیادہ وسعت بھی آئی تھی۔ وہ اس حقیقت سے قطعاً پریشان نہیں ہوتے کہ روزگار کے مواقع ہمیشہ معاشی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور نیشنلائزیشن سے معاشی ترقی کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔

ایک اور دلیل جو یہ اصحاب (Dots) بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ مشینوں کی بجائے مزدوروں کو استعمال کیا جائے تا کہ بیروزگاری کا خاتمہ ہو سکے۔ یہ کہنا بیجا ہے کہ اگر کمپیوٹر اور کاریں صرف مزدوروں ہی کے ذریعے سے بنائی جا سکتیں تو ہمارے ہاں بیروزگاری بالکل نہ ہوتی موجودہ تکنیکی دنیا میں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ایسے طریقہ ہائے کار جن میں مزدوروں کی زیادہ تعداد کو ملوث کیا جاتا ہے ان کے تحت بننے والی اشیاء کی کوالٹی گھٹیا ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ منافع اور قدر زائد (Value-added) میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ایسے اہم مسائل پر غور کئے بغیر یہ ''معاشیات دان'' حکومت سے ایسی ٹیکنالوجی کی حوصلہ افزائی کرنے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مزدوروں کو روزگار ملے۔

ترقی پسند مفکرین کو اس مشکل کا اندازہ نہیں کہ موجودہ صنعت میں ٹیکنالوجی کے استعمال کی جگہ انسانی محنت کو بطور متبادل لانا اب ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

ان دقیق اور طویل دلائل کے پیچھے سخت بے اعتمادی کارفرما ہے جو یہ ترقی پسند مفکرین (Dots) پرائیویٹ سیکٹر کے لئے محسوس کرتے چلے آ رہے ہیں اسی لئے وہ صرف اس نظریئے سے چمٹے رہتے ہیں کہ گرتی ہوئی صورتحال کو سنبھالنے کے لئے حکومتی مداخلت بہت ضروری ہے۔ ان کا یہ بھی دعوی ہے کہ آزادانہ معاشی پالیسیوں اور بغیر مسخ شدہ منصوبہ سازی Labor Intensive Growth کے لئے ضروری نہیں چنانچہ وہ حکومت کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ قرضے اور جگہ کی راشننگ کرے اس کے ساتھ ساتھ لائسنس جاری کرے اور قانون بھی بنائے۔ تا کہ پرائیویٹ سیکٹر کو نکیل ڈالی جا سکے اور اس کو آزادانہ حیثیت میں کام نہ کرنے دیا جائے۔ کبھی کبھی ان کی خواہش ہوتی ہے کہ راشننگ میں چھوٹے پیمانے کے سیکٹر کے لئے زیادہ حصہ مختص ہونا چاہئے۔ اب وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ حکومت نے جتنی بھی راشننگ کی سکیمیوں مثلاً چھوٹے کسانوں کے لئے کریڈٹ راشننگ سکیمیں۔ کوا پریٹو یا صنعتی پلاٹوں کی راشننگ وغیرہ سے بھی بالآخر طبقہ امراء کو فائدہ ہوا پھر بھی وہ منڈی کے ذرائع سے قرضے کی تخصیص کی سفارش نہیں کرتے۔

حکومت اور اس کی مختلف ایجنسیوں پر ترقی پسند مفکرین کا اعتبار اس قدر راسخ ہے کہ یہ

صوبائی سطح پر چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے محکموں کے کردار میں بھی اضافہ چاہتے ہیں۔شاید وہ یہ بتا سکیں کہ ان محکموں کے اختیارات کو بڑھانے سے چھوٹی صنعتوں کو متحرک کرنے میں کیا مدد ملے گی۔کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس طرح کے معجزاتی حل ڈھونڈنے پر وقت صرف کرنے کی بجائے عملی معاشیات کو استعمال میں لا کر یہ بات طے کر لی جائے کہ اس میدان میں حکومت کچھ نہیں کر سکتی یہ بہتر ہوگا کہ قومی خزانے کی رقم بچا لیجائے اور اس محکمے کو بند کر دیا جائے۔

سرکاری معیشت کے ماہرین پوری کوشش کرتے رہے ہیں کہ معاشی میدان میں حکومت کا زیادہ سے زیادہ کردار ہو۔منصوبہ بندی، درآمدات اور برآمدات پر براہ راست کنٹرول نیز اخراجات اور سرمایہ کاری پر حکومتی اجارہ داری وغیرہ کے علاوہ اشیاء کی پیداوار اور صحت و تعلیم کے شعبوں پر مکمل طور پر کنٹرول! یہ سب کچھ آزمایا جا چکا ہے۔ان تمام شعبوں میں حکومت مثبت نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے البتہ حکومت نے ان شعبوں سے متعلق طے کردہ منصوبوں کے لئے وسائل کو ضائع کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔اس ضمن میں حکومت نے بے شمار محکمے قائم کئے۔بہت سے کمیشن قائم کئے۔اعلیٰ عہدے بہت تیزی سے تخلیق کئے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے تحاشہ رقوم خرچ ہوئیں مگر نتیجہ کچھ برآمد نہ ہوا۔خرچ ہونے والی وہ رقوم غریب ٹیکس دہندگان کی ادا کردہ تھیں جو ہمارے معاشرے کا سب سے پسا ہوا طبقہ ہے اس لئے بھی کہ ٹیکسوں کی وصولیابی بالواسطہ طور پر ہوتی ہے جس سے ٹیکسوں کا بوجھ متوسط طبقے پر پڑتا ہے۔

ملک میں معاشیات کے متعلق جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس میں بھی گہرائی مفقود ہے۔ کلاسوں میں معاشیات کے متروک اور بے فائدہ نظریات کے بارے میں نہایت ہی بھدے طریقے سے پڑھایا جاتا ہے۔معاشی بحث مباحثہ میں بھی زیادہ تر اخراجات کے لئے مختص رقوم اور حکومت کے اخراجات کے عظیم الشان منصوبوں ہی کا ذکر ہوتا رہتا ہے اور یہ کسی نے کبھی نہیں پوچھا کہ سرکاری منصوبوں کی تکمیل بھی ہوئی یا نہیں یا یہ محض اخراجات کو بڑھانے ہی کا بہانہ تھے۔

(8)

تعلیم پر حکومتی اخراجات

اور تعلیم کی حالت زار

پاکستان میں اس قدر بڑھی ہوئی شرح ناخواندگی بہت افسوسناک ہے۔ پالیسی ساز، مفکر، صحافی، معاشیات کے ماہر اور دانشور اس بات پر صدفی صد اتفاق کرتے ہیں کہ خواندگی کی شرح میں اضافہ ہونا چاہئے کیونکہ خواندگی کے ساتھ بہت سے امید افزا امکانات مشروط ہیں۔ معاشرے میں پڑھے لکھے افراد اگر زیادہ ہوں تو اپنی استعداد کی وجہ سے وہ ناخواندہ لوگوں کی نسبت معاشی ترقی کی رفتار میں غیر معمولی اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح آبادی میں اضافے کی شرح بھی کنٹرول میں رہتی ہے کیونکہ پڑھے لکھے لوگوں کو چھوٹے کنبوں کے فوائد کا زیادہ علم ہوتا ہے۔ بعینہ صحت کے شعبے کی ترقی کا دارومدار بھی بہت حد تک لوگوں کے خواندہ ہونے پر ہے اگر وہ تعلیم سے بہرہ ور ہوں گے تو یا وہ حفظان صحت اور صفائی کے فوائد سے پہلے ہی واقفیت رکھتے ہوں گے تو انہیں اس بارے میں آگاہی فراہم کرنا بہت آسان ہوگا۔

ان تمام متوقع فوائد کے باوجود یہ حیرانی کی بات ہے کہ پھر بھی پاکستان میں خواندگی میں اضافے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ مبصرین سنجیدہ کوشش نہ کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہی ڈالتے ہیں۔ وہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حکومت کے پاس ہر شہری کے لئے بنیادی تعلیم کی فراہمی کا کوئی جامع پروگرام ہے ہی نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ شعبہ تعلیم پر حکومت پاکستان اپنی خام گھریلو پیداوار (GDP) میں سے جس قدر رقم خرچ کرتی ہے وہ شرح کے اعتبار سے دنیا میں سب سے کم ہے یہی وجہ ہے کہ تمام مبصرین اس پر متفق ہیں کہ حکومت کو اس مد کے لئے زیادہ رقم مختص کرنی چاہئے۔ صحافیوں، مفکروں، معاشیات دانوں اور رفاہی کام سرانجام دینے والوں نے بارہا یہی اپیل

کی ہے کہ حکومت تعلیم کے شعبے پر زیادہ رقم خرچ کرنے کا اہتمام کرے۔

اس دلیل کا مطلب یہی ہے کہ اگر صرف تعلیم کی مد میں مختص کی جانے والی رقم میں اضافہ کر دیا جائے تو صرف اسی سے ہی پاکستان میں خواندگی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کیونکہ جب زیادہ وسائل خرچ کئے جائیں گے تو دیہی علاقوں میں زیادہ سکول قائم کئے جاسکیں گے اور اساتذہ کی بڑی تعداد کو ملازمتیں بھی دی جاسکیں گی۔

لیکن اگر حکومت کی کارکردگی کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو یہی اندازہ ہوگا کہ ان دانشوروں کی یہ امید کہ بڑی رقم مختص کرنے سے خواندگی میں اضافہ ہو جائے گا خاصی بے بنیاد نظر آتی ہے۔ کئی حکومتوں نے مختلف پنج سالہ منصوبوں میں تمام شہریوں کے لئے بنیادی تعلیم فراہم کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ تعلیم اور تعلیمی پالیسی پر نئی دستاویزات کا بھی اجراء کیا گیا اور بڑے تزک واحتشام کے ساتھ تعلیم کو ہر ایک تک بہم پہنچانے کا اعلان کیا گیا۔ ان اعلانات اور بلند بانگ مقاصد پر صرف نظر کرتے ہوئے اگر اس حقیقت کا جائزہ لیا جائے کہ حکومت تعلیم کے شعبے پر جو کچھ بھی خرچ کرتی ہے اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یہ تمام پیسہ محکمہ تعلیم کے افسران یا تو ضائع کر دیتے ہیں یا اسے خرد برد کر لیا جاتا ہے۔ جب اعلان کردہ مقاصد کی تکمیل میں ان افسران کو ناکامی ہوتی ہے تو انہیں کوئی بھی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ہم اکثر پرائمری تعلیم کے لئے سکولوں کے قیام کے لئے دی جانے والی رقوم کے ضیائع کی کہانیاں سنتے ہیں اور جو عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں وہ بھی کچھ عرصے بعد گودام بن جاتی ہیں۔ اس طرح شعبہ تعلیم کے لئے خرچ کی جانے والی رقوم کا بڑا حصہ ٹھیک طرح سے استعمال میں نہیں آپاتا۔ مزید برآں اساتذہ بھی طلباء وطالبات کو نہایت بے دلی سے تعلیم دیتے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ تعلیمی بجٹ میں بہت کم رقم ان کی تنخواہوں کے لئے مخصوص کی جاتی ہے۔ چنانچہ مالی مجبوریوں سے پریشان یہ لاپرواہ اساتذہ کم تر درجے کی تعلیم دے پاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء ہی میں سکول چھوڑ جانے والے بچوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔

گو کہ ناخواندگی کے خاتمے میں ناکامی باعث تشویش ہے لیکن حقیقت میں افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ موجودہ افسر شاہی کے زیر انتظام تعلیم کا معیار پاتال کی گہرائیوں تک جا پہنچا ہے۔ ہر سطح پر تعلیمی نظام میں قدامت پرستی کو رواج دیا جا رہا ہے۔ قدیم نصاب اور متروک طریقہ تعلیم کے باعث تعلیم کے میدان میں ترقی معکوس ہو رہی ہے۔ ایسی کوشش کبھی نہیں کی گئی کہ طلباء کو بین الاقوامی معیار کو سامنے رکھ کر ہر تعلیمی سطح پر اس کی کارکردگی کو پرکھا جائے۔

اعداد وشمار کی کمی کے باوجود یہ بات کسی شک و شبہ کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ سرکاری اداروں میں دی جانے والی تعلیم کا معیار بہت گرا ہوا ہے جو بین الاقوامی معیار سے بہت کمتر ہے۔ اس بات کی توثیق بچوں کے والدین کی ان کی تعلیم کے بارے میں کئے جانے والے اداروں کے انتخاب سے ہوتی ہے وہ والدین جن کے ذرائع وافر ہیں وہ اپنے بچوں کو پرائیویٹ سکولوں میں داخل کرواتے ہیں جہاں بھاری فیسیں وصول کی جاتی ہیں حالانکہ سستے سرکاری سکول گلی گلی موجود ہیں۔لیکن انہیں اس بات پر قائل نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے بچوں کو ان سکولوں سے تعلیم دلوائیں۔اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ بچوں کے والدین کا یہ پختہ یقین ہے کہ ''آپ جس قدر ادا کریں گے آپ کو اسی قدر ملے گا'' اور ''اگر آپ اپنے بچے کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ اپنے بچے کو پرائیویٹ سکول میں بھیجیں'' حتی کہ وہ والدین جن کے وسائل بہت محدود ہوتے ہیں وہ بھی اپنے بچوں کو سرکاری سکولوں کی گھٹیا تعلیم دلانے سے گریز کرتے ہیں چنانچہ بڑی تعداد میں بچے یا تو سکولوں میں جاتے ہی نہیں اور اگر جاتے بھی ہیں تو بھی ابتدائی سالوں ہی میں وہ انہیں خیرباد کہہ دیتے ہیں۔

بہت عرصے سے تعلیم پر خاص طور پر اعلیٰ تعلیم پر نوکر شاہی کی اجارہ داری قائم ہے جس کے نتائج بڑے دلچسپ ہیں۔ایک وقت وہ تھا جب پاکستان کے بیشتر لوگ سرکار کی زیر پرستی چلنے والے اداروں مثلاً گورنمنٹ کالج لاہور وغیرہ کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کافی سمجھتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہے۔اب ان اداروں میں فراہم کی جانے والی تعلیم کا معیار اس قدر پست ہو گیا ہے کہ لوگ بھاری رقوم خرچ کر کے اپنے بچوں کو یورپ یا امریکہ بھیجتے ہیں حتی کہ وہاں کے تیسرے درجے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو بھی پاکستان کے اعلیٰ ترین اداروں سے بہتر گردانا جاتا ہے۔یورپ یا امریکہ کی یونیورسٹیوں کی انتظامیہ بھی والدین کے ان خیالات کو تقویت دیتی ہے کہ جنہوں نے باہر کی ڈگری کے لئے بھاری رقوم خرچ کی ہوتی ہیں۔

اس پس منظر میں تعلیم کے شعبے میں حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تعلیمی پالیسی جس میں صرف اور صرف تعلیم کے حوالے سے حکومت کے اخراجات میں اضافے پر ہی زور دیا جائے وہ صرف ناکام ہی ہو سکتی ہے۔اس قدر پھیلتی ہوئی تعلیمی بیوروکریسی کو

قطعاً مزید رقم مہیا نہیں کرنی چاہئے جو کہ نہ صرف خواندگی کو عام کرنے میں ناکام رہی بلکہ جو اعلیٰ تعلیم کا تھوڑا بہت نظام پہلے سے کام کر رہا تھا اسے بھی تباہ کر دیا۔ اس طرح ہم نے تعلیم پر پیسہ تو بے تحاشہ خرچ کر دیا لیکن اس سے کسی قسم کے مثبت نتائج برآمد نہیں ہو سکے۔ چنانچہ اس مرحلے پر تعلیمی اخراجات میں مزید اضافہ کرنے کا مطلب یہی ہوگا کہ۔

(9)

حکومت اور اشتہارات

پچھلی دو دہائیوں کے دوران کئی ایک اہم امور پر اگر حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ملک میں جس قسم کی حکومت ہے اسے ہم ''حکومت بذریعہ اشتہارات'' کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ حکومت نے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات میں در آنے والی نئی تبدیلیوں سے نپٹنے کے لئے نہ تو قانون سازی کی اور نہ ہی ضوابط تشکیل دیئے۔ حتی کہ قانونی اور ریگولیٹری ورثہ جو ہمیں انگریزوں سے ملا اسے بھی برقرار نہ رکھا جا سکا۔

قانونی بانجھ پن سے رچی ہوئی اس فضا میں حکومت موجودہ قوانین کو نافذ کرنے کی اپنی کوششوں میں بری طرح سے ناکام رہی ہے۔ اس ناکامی کے باعث سفید پوش جرائم میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ پچھلے تمام عرصے میں سفید پوش جرائم میں ملوث کسی ایک بھی اہم شخص کو نہیں پکڑا گیا اور حکومت بھی یہ تسلیم کرتی ہے۔ کوئی ایک ایسی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ کسی ٹیکس نادہندہ کے خلاف کوئی تحقیقات کی گئی ہو اسے پکڑ کر جیل میں ڈالنا تو دور کی بات ٹھہری۔ بجائے اس کے کہ حکومت کے نظام کے محافظ کی حیثیت سے مجرموں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچائے اور قوانین کے نفاذ کو یقینی بنائے وہ جرائم اور غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اشتہار دے دینا ہی کافی سمجھتی ہے۔ اس سے یہی مطلب نکلتا ہے۔ کہ حکومت کو مجرموں سے امید ہے کہ وہ صرف اشتہاروں سے ہی متاثر ہو کر جرائم کرنا بند کر دیں گے۔

آیئے اپنے نقطے کو واضح کرنے کے لئے میں آپ کی توجہ مالی کاروبار کی مارکیٹ پر بیتی صورتحال پر دلاتا چلوں اور یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ حکومت کا ان مخصوص حالات پر کیا ردعمل تھا۔

1- علامات:-

1979-80ء کے دوران ملک میں بہت سی فنانس کمپنیاں قائم ہوئیں ان کو کچھ حد تک حکومتی آشیر باد بھی حاصل تھی۔ان کمپنیوں میں سے بعض مقابلے کی دوڑ میں آگے نکلنے کی خاطر اپنے ہی فریب میں آ گئیں اور دیوالیہ پن کا شکار ہوگئیں اور کچھ بدانتظامی کا شکار ہوئیں یا کئی ایک فراڈ کا بھی شکار ہوگئیں۔ بہرحال جو بھی وجوہات تھیں 1979ء تک فنانس کمپنیوں کا کھیل کھٹائی میں پڑ گیا۔

حکومتی ردعمل:-

اس بحران پر حکومتی ردعمل قطعاً غیر متوقع تھا۔ اس نے نہ تو کسی قسم کے سخت قوانین متعارف کروائے نہ کوئی ضوابط نافذ کئے۔حکومت نے نہ ہی کوئی سنجیدہ تحقیقات کروائیں تا کہ ان کی بے ایمانی اور فراڈ کی پوری حقیقت معلوم ہو سکے۔اس نے اخبارات میں محض اشتہار دے دینا ہی کافی سمجھا۔جس میں عوام کو ان کمپنیوں کے خلاف تنبیہہ کی گئی تھی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کمپنیاں جو اپنے کاروبار میں سنجیدہ تھیں اور قواعد وضوابط کے مطابق کام کر رہی تھیں عوام میں ان کا وقار بھی مجروح ہو۔

نتیجہ:-

اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں تمام فنانس کمپنیاں بند ہوگئیں۔ بڑی تعداد میں کھاتے داروں کی رقوم ڈوب گئیں۔اس کے باوجود کسی مینجر یا کمپنی کے مالک کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی نہ ہوئی اور یہ ''آجز'' سرمایہ اور فراڈ کرنے کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد نئے اعتماد کے ساتھ فراڈ اور دھوکہ دہی کی بڑی کھیلوں میں مصروف ہو گئے نہ اس فراڈ کی ذمہ داری کسی وزیر نے قبول کی اور نہ اس وقت کے وزیر خزانہ یا سنٹرل بنک کے گورنر نے استعفیٰ دیا اور نہ ہی ان کے استعفیٰ کا کسی نے مطالبہ کیا۔

2- علامات:-

1987ء میں مذکورہ بالا تجربے کو دہرایا گیا۔ یہاں افسروں کی مال و دولت' کالے دھن اور ستر کی دہائی کے دوران بیرون ملک جانے والے افراد کے بھیجے ہوئے پیسوں سے حاصل ہونے والی بچت سے پاکستانیوں کے پاس اس قدر سرمایہ اکٹھا ہو گیا تھا کہ اس سے سرمایہ کاری کی جا سکتی

تھی۔لیکن حکومت ان تمام رقوم کو اپنے استعمال میں لے آئی اس نے زیادہ منافع کی شرہ کا اعلان کر کے اندرونی قرضوں کا دائرہ وسیع کر لیا اس طرح مالی خسارے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

اس دوران پرائیویٹ سیکٹر نے وہ کچھ کیا جس پر اسے مکمل دسترس تھی۔اس نے منڈی کے رخ پر اپنے آپ کو ڈھال لیا۔اس قدر سرمایہ کی موجودگی میں 1987ء کے دوران فنانس کمپنیاں دوبارہ منظر عام پر آ گئیں۔ترقی کرتی معیشت' اضافی سرمائے اور شہری جائیداد کی قیمتوں میں نمایاں اضافے کے باعث سرمایہ کاری کے لئے امید افزاء حالات پیدا ہو گئے۔چنانچہ سرمایہ کاروں نے ایک مرتبہ پھر فنانس کمپنیوں میں اپنا سرمایہ لگانا شروع کر دیا۔

حکومت ردعمل:۔

اگر چہ اس مرتبہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی اس کے باوجود ہمارے معاشی نظام کے رکھوالوں مثلاً سٹیٹ بنک یا وزارت خزانہ نے ان کمپنیوں کے لئے کسی قسم کا کوئی ضابطہ یا قانون بنانے کی کوشش نہ کی۔لہذا حکومت نجی شعبہ میں جنم لینے والی ان جدت طرازیوں کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہی کیونکہ اسے اب تک کنٹرولڈ سسٹم میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا تھا اسی لئے نجی شعبہ سے نپٹنا اس کے بس میں نہ تھا۔اسے اسی کام پر قدرت حاصل تھی کہ جب بھی فنانس کمپنیاں ذرا سی بھی مشکلات کا شکار ہوں تو وہ (حکومت) اشتہار بازی پر اتر آئے اور لوگوں کو ان کے چنگل سے بچے رہنے کی تلقین کرے اور اس نے یہ کام بڑی خوبی سے سرانجام دیا۔اشتہار بازی کی مہم تو حکومت نے بڑے اہتمام کے ساتھ چلائی لیکن اس نے ان کمپنیوں کے لئے اس مرتبہ بھی کوئی ضابطہ یا قانون بنانے کی زحمت گوارانہ کی اور نہ ہی کھاتے داروں کے پیسے ہضم کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی۔

اسی عرصے میں بعض ایسی کمپنیوں نے بھی جن کی ساکھ موثر طور پر قائم ہو چکی تھی حکومتی پراپیگنڈا مہم کے اثر کو زائل کرنے کے لئے اشتہار بازی شروع کی۔انہوں نے مطالبہ کیا کہ ایسا قانون بنایا جائے جس کے تحت ذمہ دار اور اہلیت کی حامل کمپنیوں کے وجود کو یقینی بنایا جا سکے اور انہیں عوام میں اپنے لئے اعتماد کی فضاء قائم کرنے کا موقع بھی دیا جائے۔انہوں نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ تمام کمپنیوں کے اثاثہ جات اور نظام کار کی اچھی طرح سے تحقیقات کرائی جائیں۔ان کمپنیوں نے اشتہاروں کے ذریعے یہ بھی واضح کیا کہ وہ کھاتے دار جو اپنی رقم واپس لینا چاہتے ہیں

انہیں ان کی رقم فوراً واپس کر دے گی اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حکومت سے بھی التجا کی کہ وہ اپنا زہر آلود پراپیگنڈہ بند کر دے کیونکہ اس طرح کا پراپیگنڈہ کسی بھی ادارے کے لئے خاتمے کا باعث ثابت ہوسکتا ہے بیشک وہ ادارہ مالی طور پر جتنا بھی مستحکم کیوں نہ ہو۔ان کمپنیوں نے یہ بھی کہا کہ اپنی ہی حکومت اور مرکزی بینک کو اپنے ہی ملک کے اداروں کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

نتیجہ:-

پہلے وقوع پذیر ہونے والے بحرانوں کی طرح حکومت کی طرف سے شروع کی جانے والی پراپیگنڈہ مہم نے تمام فنانس کمپنیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔کھاتے دار ایک مرتبہ پھر اپنے پیسوں سے محروم ہوئے لیکن نہ تو کوئی فنانس کمپنی کا مالک پکڑا گیا اور نہ ہی کسی برانچ مینجر کی گرفتاری عمل میں آئی۔ان کمپنیوں کے زیادہ بے ایمان مالکوں کو پیسہ اکٹھا کرنے کا موقع ملا اور اس کے ساتھ ہی انہیں ایسا کرنے میں مہارت بھی حاصل ہوئی چنانچہ انہوں نے فراڈ سے حاصل کیا ہوا یہ پیسہ شہری جائیداد خریدنے میں صرف کیا اس مرتبہ بھی نہ تو کسی وزیر نے اس سکینڈل کی ذمہ داری قبول کی اور نہ ہی وزیر خزانہ یا سٹیٹ بنک کے گورنر نے استعفیٰ دیا۔کسی نے ان کے استعفے کا مطالبہ بھی نہ کیا۔

البتہ اس مرتبہ ایک فرق دیکھنے کو ضرور ملا۔اب حکومت کو بین الاقوامی اداروں کی معرفت یہ احساس ہوا کہ اب مالیاتی میدان میں تبدیلی لانا بہت ضروری ہوگیا ہے چنانچہ اچانک منظر عام پر آجانے والی کمپنیوں کو کامیابی سے بند کروانے کے بعد حکومت نے اپنی کمپنیاں کھولنی شروع کر دیں اور اپنے پسندیدہ افراد کو فنانس کمپنیاں کھولنے کے لائسنس دینے شروع کر دیئے۔نامی گرامی افراد مثلاً علی، بی سی سی آئی اور کریسنٹ گروپ کو لائسنس عطا کئے گئے۔باقی ماندہ لوگ جو سرمایہ کاری کرنے کے متمنی تھے اور وہ جو ایمانداری سے تبدیلی لانے کے خواہاں تھے انہیں ہر طرح کے مواقع سے محروم کر دیا گیا۔

3-علامات:-

جب لائسنس جاری کرنے کا عمل جاری تھا اور بھاری قرضے نئے قرض خواہوں کو بانٹے جا رہے تھے اور فاضل سرمائے کی موجودگی نے سرمایہ کاری کے لئے مواقع فراہم کر دیئے تھے۔مشرق وسطی گئے ہوئے افراد کی طرف سے بھیجا گیا پیسہ ابھی بھی پاکستان کی معیشت کے ستون کی حیثیت

رکھتا تھا اس کے ساتھ ساتھ بیرونی امداد بھی آ رہی تھی جسے صاحبان اقتدار اپنے حواریوں میں بانٹ رہے تھے۔ علاوہ ازیں لوگ سمگلنگ کے ذریعے سے غیر ملکی کرنسی جمع کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجی شعبہ سے متعلق افراد کے پاس بھاری مقدار میں سرمایہ جمع ہو گیا اور اب اس پیسے کی سرمایہ کاری کا بہت مناسب موقع تھا۔

ان دنوں جب حکومت اپنے حواریوں کو انوسٹمنٹ بینک اور فنانس کمپنیوں کے لائسنسوں سے نوازنے کے طویل اور سست ردعمل سے گزر رہی تھی نجی شعبے نے اس میدان میں سرمایہ کاری کرنے میں پہل کر دی۔ چونکہ نجی شعبے کے سرمایہ کاروں کو جدت طرازی کی کامل صلاحیت حاصل ہے چنانچہ انہوں نے اس دفعہ بھی کمال کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اس ضمن میں پاکستان میں آزادی سے پہلے سے نافذ العمل قانون میں سقم تلاش کر لیا۔ اس قانون کے تحت کوا پریٹو ادارے انوسٹمنٹ بینکوں کی طرح کام کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ چنانچہ نجی شعبے کے سرمایہ کاروں نے اس قانونی سقم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوا پریٹو ادارے قائم کر لئے جن میں منافع کی شرح کافی زیادہ رکھی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے دھڑا دھڑ پیسے ان اداروں میں جمع کروانے شروع کر دیئے۔ اس طرح پورے ملک میں کوا پریٹو اداروں کا جال بچھ گیا اور نوے کی دہائی میں یہ کوا پریٹو ادارے ماضی کی فنانس کمپنیوں کا روپ دھار گئے۔

حکومتی ردعمل :-

شاید حکومت ان لائسنس یافتہ افراد (انہوں نے حکومت کی سرپرستی میں فنانس کمپنیاں کھولنے کا ارادہ کر رکھا تھا) کے مفادات کی حفاظت کر رہی تھی یا اپنے ان بااثر حواریوں کی نگہداشت کرنے کی خواہش کر رہی تھی جنہوں نے کوا پریٹو اداروں سے قرضے لے رکھے تھے۔ لیکن یہ بات لازمی ہے کہ کھاتے داروں کا مفاد کسی کو عزیز نہ تھا۔ اپنی پچھلی روایات پر عمل کرتے ہوئے حکومت نے ایک مرتبہ پھر کوا پریٹو ادارے کے خلاف پراپیگنڈا کی مہم چلائی اس کے علاوہ اسے کسی قسم کی کارروائی کرنے کی توفیق نہ ہوئی نہ تو آڈٹ ہوا نہ سٹیٹ بنک نے مجرموں کے اثاثے منجمد کئے اور نہ ہی ان اداروں کے مالکان کو قید و بند کی سزا ہو سکی۔ حکومت نے کھاتے داروں میں ان اداروں کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر دینا ہی کافی جانا۔

نتائج :-

شکوک وشبہات کا بیج جوان کواپریٹو اداروں کے بارے میں حکومت نے عوام کے دلوں میں بو دیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تمام کے تمام ادارے ختم ہو گئے۔ کھاتے دار ایک مرتبہ پھر اپنی جمع کرائی ہوئی رقوم سے محروم ہوئے اور برانچ مینجروں یا اداروں کے مالکان یا ان کے سیاستدان/ بیوروکریٹ دوستوں میں سے کسی پر بھی کوئی مقدمہ نہ چلا انہیں سزا دینا تو دور کی بات ٹھہری۔ ممکن ہے یہ حضرات اسی طرح کا کوئی اور کھیل کھیلنے کا سوچ رہے ہوں جس کے ذریعے انہیں پیسے حاصل کرنے کا موقع بھی ملے اور ان کی سر کوبی بھی نہ ہو۔ چونکہ اس قسم کے فراڈ کی تحقیقات کرنے کا رواج ہمارے ہاں سرے سے ہے ہی نہیں اس لئے یہاں ایسے ماہرین کا پتہ بھی نہیں چل سکتا جو لوگوں کے پیسے کو باطریق احسن سنبھال سکیں اور ان کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ایسے زری فراڈوں کے بعد جو راستہ حکومت اپناتی ہے اس سے نہ صرف بد دیانت ادارے اپنے انجام کو پہنچتے ہیں بلکہ جو پیشہ وارانہ تقاضوں کو پیش نظر رکھ رہے ہوں ان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کھاتے داروں کی رقم ڈوب جاتی ہے اور وزارت خزانہ اور سٹیٹ بنک کے گورنرز سے مس ہوئے بغیر اپنی اپنی کرسیوں پر جمے رہتے ہیں۔

البتہ کواپریٹو سکینڈل کے سلسلے میں افواہ تھی کہ کھاتے دارون کی رقوم کی واپسی کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ اس عرصے میں پاکستانی معیشت خاصی کمزور ہو گئی تھی 1980ء کی دہائی نہ صرف پاکستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے قصہ پارنیہ بن چکی تھی مشرق وسطی سے آنے والی رقوم میں بھی نمایاں کمی واقع ہو گئی۔ جغرافیائی وسیاسی حالات بھی پہلے جیسے نہ رہے اور باہر سے آنے والے سرمائے کی مقدار بھی کم ہو گئی۔ ان حالات اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں حکومت یہ سمجھ چکی تھی کہ لٹنے والوں سے لوٹنے والے زیادہ طاقتور اور کارآمد ہیں چنانچہ حکومت نے اس بحران کو سرد خانے کی نذر کیا اور کواپریٹو سکینڈل ماضی کا ایک گم گشتہ ورق بن کر رہ گیا جس کا تذکرہ اب صرف اخباروں میں ایڈیٹر کے نام خطوط میں ہی ہوتا ہے۔

حتمی نتیجہ :-

ان تینوں واقعات سے حکومت نے نتیجہ اخذ کیا کہ حکومت کرنے کے لئے اشتہار بازی ہی بہت کافی ہے۔ وہ اپنے اعمال کے ذریعے یہ تسلیم کرتی ہے کہ سرمایہ دار ہی دراصل اس کا حلقہ انتخاب

ہیں نہ کہ عوام۔ چنانچہ وہ عوام کے لئے نہ تو قانون سازی کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور نہ ہی ضوابط بنانے کی اور حکومت کو موجودہ قوانین کو نافذ کرنے کی سیاسی غلطی کرنے کا خطرہ ہرگز مول نہیں لینا چاہتی۔ وہ پریس میں اشتہار چھپوا دینا ہی کافی سمجھتی ہے کیونکہ اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسے عوام کے مسائل کے بارے میں تشویش ہے۔

حالیہ دنوں میں حکومت کو ملاوٹ کے بارے میں خاصی تشویش لاحق ہے لیکن اس نے ملاوٹ کا سدباب کرنے کے لئے کسی قسم کے اقدامات نہیں کئے اور نہ ہی خالص پن کا کوئی معیار قائم کیا ہے۔ علاوہ ازیں حکومت کے ان معاملات کی تحقیقات کا واضح طریقہ کار بھی موجود نہیں اور نہ ہی وہ ان جرائم میں ملوث افراد کو سزا دینے کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس جرم میں نہ تو کوئی پکڑا گیا ہے اور نہ ہی کوئی پکڑا جائے گا۔ البتہ حکومت کے بس میں اشتہار چھپوا دینا ہے جو وہ بہت خوبی سے کر رہی ہے یعنی ملاوٹ کے خلاف اشتہارات چھپوانا' اخبارات کے صفحہ اول پر صفحہ آخر پر حتیٰ کہ درمیانے صفحات پر بھی ملاوٹ کے خلاف اشتہارات روزمرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ شاید حکومت کے ایسا کرنے کا مقصد اخبارات کو زائد آمدنی فراہم کرنا ہے تاکہ وہ حکومت سے خوش رہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ کو رشوت دینے کا ایک طریقہ جس کی مدد سے حکومت اسے اپنی نااہلی اور بددیانتی کو مشتہر کرنے سے روکتی ہے۔ چلئے اگر ان اشتہارات سے ملاوٹ میں کمی نہ بھی آئے تب بھی یہ اشتہار کسی کے کام آتے تو ہیں۔

(10)

حکومت شریک کار یا لٹیری

طویل عرصے سے ہم حکومت کے پروردہ، مائل بہ ترقی مفکروں کو جنہیں ہم ماہرین معاشیات یا ''ڈاکٹرز'' کے طور پر بھی جانتے ہیں ان کے پندونصائح سنتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں مسلسل یہی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں حکومت کا زیادہ سے زیادہ دخل بہت ضروری ہے' کیونکہ حکومت ہی کے پالیسی سازوں کو بہتر انداز میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو کیا خرچ کرنا چاہئے کیا درآمد کرنا چاہئے کونسا کام کرنا چاہئے اور کہاں کام کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ اگر عقل کل کے ان اجارہ داروں پر چھوڑ دیا جائے تو یہ زندگی کے ہر پہلو پر حکومتی پہرہ بٹھا دیں۔

معیشت کے ہوالے سے پاکستان میں فکری ڈھانچے کا بیشتر حصہ اسی قماش کے ماہرین معاشیات کی تخلیق ہے جنہیں اپنے خیالات ونظریات کو فروخت کرنے کا ڈھنگ بخوبی آتا ہے۔ یہ لوگ ابھی ایک نظریئے یا دلیل کے ذریعے سے یا کبھی دوسرے نظریئے کو پیش کر کے حکومت کے اجارہ دارانہ کردار کو مستحکم بنانے کا جواز فراہم کرتے رہے ہیں ان ماہرین معاشیات کے خیالات ونظریات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ پاکستان کی تاریخ کے ہر موڑ پر انہوں نے حکومتی وسعت کا دفاع کیا اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ وہ وسیع حکومت کے حق میں دلائل غریبوں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر دیتے ہیں۔

ان معاشیات دانوں کو یقین واثق ہے کہ حکومت ہی غریبوں کی واحد خیر خواہ ہے اسی لئے ہر طرح کے عمل یا سرگرمی میں حکومت کی دخل اندازی لازمی ہے۔ ان کے خیال میں حکومت نہ تو وسائل کو ضائع کر سکتی ہے نہ ہی وہ نااہلی کا مظاہرہ کر سکتی ہے اور اس کے اس قدر ذرائع ہیں کہ وہ کبھی

بھی غریبوں پر ٹیکس نافذ نہیں کر سکتی بلکہ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ان کا ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ حکومت کو کنٹرول کرنے والے مفاد پرست عناصر جو (مذکورہ بالا) ڈاکٹروں کو ملازمت فراہم کرتے ہیں انہیں وسیع حکومت ہی کے ذریعے سے تہذیب کے دائرے میں رکھا جا سکتا ہے۔اگر چہ حکومت کی بنیادی ذمہ داری تو یہی ہے کہ ان مفاد پرست عناصر کی حاجات کو پورا کرے لیکن غرباء اور مفلوک الحال عوام کی ضروریات کا بھی اگر کوئی خیال رکھ سکتا ہے تو وہ حکومت ہی ہے۔ چنانچہ اس ملک کو ہر حال میں منڈی میں ہونے والے مقابلے سے بچائے رکھنا بہت ضروری ہے۔اور پہلے سے ہی وسیع اور مزید وسعت اختیار کرتی ہوئی حکومت خواہ وہ کتنی ہی کرپٹ اور نااہل کیوں نہ ہو عوام کی حفاظت کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ مارکیٹ اور اشیاء کا آزادانہ مقابلہ ہماری فطرت و روایات سے مطابقت نہیں رکھتا۔

ڈاکٹر محبوب الحق کی قیادت میں معاشیات کے ان ماہرین نے ہر طرح کی تھیوریاں پیش کیں اور دلائل کا انبار لگا دیا جس سے حکومتی کنٹرول اور اس کے وضع کردہ ضوابط کا جواز فراہم ہوتا تھا۔ان کی شروع کردہ منصوبہ بندی سے ایک ایسے عہد کا آغاز ہوا جس میں معیشت قوانین وضوابط کے زنداں میں قید ہو کر رہ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کا کردار اس مخصوص شعبہ میں حد سے بھی تجاوز کر گیا جس میں آج تک کمی نہیں ہو سکی۔

ساٹھ کی دہائی کے آخری ایام میں ماہرین معاشیات منضبط معیشت کی اس حالت سے جو کہ ان کی اپنی تخلیق تھی اور ان کے آقاء (بیوروکریٹس) اس کے ناخدا تھے پوری طرح مطمئن نظر نہ آتے تھے چنانچہ انہیں حکومت کے کردار میں شدید اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بائیس خاندانوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا شروع کر دیا نجی شعبہ مستقل طور پر ان کا حدف تنقید بن گیا انہیں ہر طرف اجارہ داریوں کا جال بچھا نظر آنے لگا۔ ہر وقت اس بات کا پراپیگنڈہ کیا جانے لگا کہ دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہو گیا ہے۔اس حقیقت کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا نہ ہی اس کی طرف ان ماہرین نے اشارہ کیا کہ اجارہ داریوں کے قیام کی ذمہ داری حکومت کی ہے جس نے ایسے ضوابط بنائے اور مخصوص لوگوں کو لائسنس دیئے جس کی وجہ سے اجارہ داریاں قائم ہوئیں۔اس وقت یہ سب یک زبان ہو کر نجی شعبہ کو تباہ کر دینے کی تجویز پیش کر رہے تھے۔اس طرح انہوں نے نیشنلائزیشن کی علمی بنیاد فراہم کر دی جس سے حکومت کے کردار میں مزید وسعت آ گئی۔

معاشیات کے ان کوتاہ بین ماہرین نے اپنی ابہام سے پرسوچ سے یہ ثابت کر دیا کہ معیشت کی دیکھ بھال کرنے کے لئے کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہرگز نہیں جو معاشیات کے مضمون کا طالب علم رہا ہو اور اس شعبے میں ید طولی رکھتا ہو۔ اس طرح کی بے سروپا سوچ کے منظر عام پر آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک انجینئر یعنی ڈاکٹر مبشر حسن جو معاشیات کے مضمون سے نابلد تھے ماہر معاشیات بن بیٹھے۔ انہوں نے اپنے حواری دیگر ماہرین معاشیات کی مدد سے حکومت کی پہلے سے وسیع سرحدوں کو مزید وسعت دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب ڈاکٹر مبشر حسن نے وزارت خزانہ کا قلمدان سنبھالا تو حکومت کے کردار کو مزید وسعت اسی صورت میں دی جا سکتی تھی کہ اسے براہ رست پیداواری عمل میں شریک کر لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ہر طرح سے نیشنلائزیشن کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اس طرف توجہ دیئے بغیر کہ آیا حکومت ان قومیائے گئے اداروں کو سنبھالنے اور چلانے کی اہلیت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ حکومت کے حجم میں ہونے والے اس غیر معمولی اضافے سے بھی اس عصر مخصوص کے ماہرین معاشیات کی تشفی نہ ہوئی۔ چنانچہ ماہرین معاشیات کے سربرہ (ڈاکٹر مبشر حسن) نے ایک ایسی سکیم وضع کی جس سے سرکاری شعبے (Public Sector) کو مزید وسعت دی جا سکتی تھی۔ موصوف نے دیکھا کہ پبلک سیکٹر کے تحت کارپوریشنیں قائم کرنا چنداں مشکل نہیں بلکہ حد درجہ آسان ہے اس نئی سکیم سے حکومت کو ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوا کہ اب وہ بااثر افراد کو پبلک سیکٹر کے تحت قائم ہونے والی کارپوریشنوں کو جاگیر کے طور پر دے سکتی تھی جیسا کہ نوآبادیاتی عہد میں حکومت اپنے حواریوں کو سرکاری زمینوں کے وسیع قطعات دے دیا کرتی تھی۔ اس جدت سے بھرپور سکیم کا فوری طور پر اثر یہ ہوا کہ سرکاری شعبے میں قائم ہونے والی یہ کارپوریشنیں اس قدر تیزی سے وجود میں آنے لگیں جیسے پاکستان میں خرگوش جنم لیتے ہیں۔

1977ء میں جب مارشل لاء لگا تو مارشل لاء کے پرانے حامی (ڈاکٹر محبوب الحق) کی خدمات دوبارہ حاصل کر لی گئیں۔ اس نے وسیع حکومت کے قیام کے حق میں نئے دلائل دیئے۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے ماضی کا تجزیہ کرتے ہوئے ترقی کے عمل میں نجی شعبے کی حوصلہ افزائی تو کی لیکن اس کا دل غریبوں کے لئے خون کے آنسو رو رہا تھا اور اس سے تو کوئی بھی انکار نہ کر سکتا تھا کہ غریبوں کو عرصہ ہائے دراز سے ان کے اقتصادی حقوق سے محروم رکھا جا رہا تھا اور یہ ڈاکٹر صاحب غربت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں حکومت پر یہ واجب تھا کہ غریبوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرے۔ اس

طرح ڈاکٹر محبوب الحق نے حکومتی اہلکاروں کی اس پریشانی کو دور کر دیا تھا۔ اب حکومت کو ایک نیا جواز فراہم ہو گیا تھا کہ وہ اپنی پھیلی ہوئی سرحدوں کو مستحکم کر لے بلکہ اپنی نااہلی اور مسائل کے باوجود حکومت غریبوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرنے کے لئے اپنے حجم میں مزید اضافہ کر لے۔

''غریبوں کے لئے بنیادی ضروریات'' کا نعرہ لگا کر ایک دہائی کا عرصہ بخیر وخوبی گذر گیا۔ لیکن اس کے بعد یہ نعرہ کشش کھونے لگا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عام خواندگی، صحت عامہ اور حفظان صحت کو بہتر بنانے کے بیشتر حکومتی منصوبے ادھورے رہے اور تمام کے تمام وعدے وفا نہ ہوئے۔

اب نوے کی دہائی ہے جب کمیونزم سرے سے ختم ہو چکا ہے۔ اور حکومت کے اضافی کردار پر ہر طرف سے تنقید ہو رہی ہے۔ نجکاری اور مارکیٹ اکانومی اس صدی کی مقبول ترین اصطلاحات بن چکی ہیں اسی وجہ سے حکومت، سیاستدان اور بیوروکریسی خوفزدہ ہیں تقریباً اسی نوعیت کا خوف ان مخصوص مفاد رکھنے والے عناصر پر بھی طاری ہو چکا ہے جو اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمیشہ حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان عناصر کے لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ حکومت کا اس حملے سے دفاع کریں۔

ایسے موقعوں پر ماہرین معاشیات حکومت کے لئے خدا کی رحمت بن کر نازل ہوئے۔ ہمیں ان ماہرین اور معاشیات سے متعلقہ ڈاکٹروں کی اس اہلیت کو خراج تحسین پیش کرنا چاہئے جسے کام میں لا کر وہ اس قدر تیزی سے نئی تھیوریاں اور دلائل گھڑتے ہیں جن کی مدد سے زندگی کے ہر شعبے پر حکومت کے غلبے کی افادیت ثابت کی جا سکتی ہے۔ یہ حضرات اس بات کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں کہ منڈی میں کارفرما قوتیں (Market Forces) ترقی نہ کر سکیں۔ نوے کی دہائی میں جب معاشیات کے بین الاقوامی دھارے نے رخ بدلا تو ان ماہرین معاشیات کو حکومت کے انتہائی غلبہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے پھر طلب کر لیا گیا۔

ان ماہرین معاشیات کی ذہانت اور سمجھ بوجھ پر تو یقیناً شک نہیں کیا جا سکتا انہیں یہ معلوم تھا کہ وہ ماضی کی طرف لوٹ نہیں سکتے اب ضوابط کی بھرمار یا نیشنلائزیشن، زرعی اصلاحات، درآمدات پر پابندی وغیرہ جنہیں ماضی میں کافی پذیرائی حاصل تھی اب مذاق سے زیادہ کچھ حقیقت نہ رکھتی تھیں۔ آجکل مارشل لاء بھی ماضی کا گم گشتہ ورق بن چکا ہے اور جمہوریت کا دور دورہ ہے آج کے زمانے میں کسی کو صرف اس بنا پر تشدد یا ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا کہ اس کی جیب میں غیر ملکی کرنسی ہے۔

معاشیات کے ان ماہرین کو اس تبدیلی کا اچھی طرح سے علم ہے۔ اب وہ ایک ایسے نظریئے/نعرے کی تلاش میں تھے جو جمہوری روح کے منافی بھی نہ ہو۔ منڈی کی قوتوں سے بھی

مطابقت رکھتا ہواوراس سے حکومت کے غلبے پر بھی کسی قسم کا حرف نہ آئے۔اس نئے نظریئے کو انہوں نے اشتراک حکومت (Participatory Government) کا نام دیا اس نظریئے کے تہت حکومت کوعوام کی زندگیوں کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے کا مکمل اختیار تھا اور ان منوصبوں کی تکمیل کے لئے بھاری رقوم کوخرچ کرنا بھی ان ماہرین کے مدنظر تھا جس سے بہت زیادہ مالیاتی خسارہ وجود میں آیا۔ان منصوبوں میں جہاں زیادہ اختیار حکومت کو دیا گیا تھا تھوڑی بہت عوام کی شرکت کا بھی اہتمام کر دیا گیا تا کہ جمہوری اصولوں کا پاس رہے۔لہذا حکومت کوقوم سے مشورہ کرنے کے بعد منصوبہ سازی اوراس منصوبے کے نفاذ کے لئے اقدامات کرنے کی تجویز دی گئی۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ حکومت قوم سے کس طرح مشورہ کرتی ہے ان دونوں میں اشتراک کیسے عمل میں آتا ہے؟ ماہرین معاشیات کے مطابق این جی او (Non-Government Organization) کوقوم اور حکومت کے اشتراک میں رابطے کا کردار ادا کرنا چاہئے ان ماہرین کی اکثریت نے ایسی ہی این جی او تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں اور غیر ملکی ڈونرز یا حکومت کی طرف سے انہیں بھاری رقوم گرانٹوں کے طور پر ملتی ہیں۔ان بھاری رقوم کو دیکھتے ہوئے پیشہ ور موقع پرستوں اور منافع خوروں (Rent Seekers) نے بھی اپنی این جی او تنظیمیں قائم کرنا شروع کر دیں اوراب یہ تنظیمیں پیسہ بنانے کا جائز ذریعہ بن چکی ہیں۔

ممکن ہے یہ ماہرین معاشیات ہمیں یہ بتا سکیں کہ ہم ایک لٹیرے کے ساتھ کیسے اشتراک کریں شاید انہیں حکومت بطور لیٹرا کے نظریئے سے واقفیت ہی نہ ہو اور اگر وہ اس نظریئے سے واقف ہوں تب بھی انجان بن رہے ہوں۔ ہماری حکومت اس اعتبار سے لٹیری ہے کہ وہ عوام کے وسائل کو توہڑپ کر جاتی ہے مگر اس کی بھلائی کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دیتی۔یہ ایک اور اعتبار سے بھی لٹیری ہے کیونکہ ان افراد کی حفاظت کرتی ہے جو عوام کا اقتصادی استحصال کرنے میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتتے اور حکومت بجائے عوام کی خدمت کرے اس طرح کے استحصالی مفاد پرستوں کی خدمت کرنا اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔خواہ وہ شہریوں کی عمر بھر کی کمائی لوٹ کر غائب ہو جائیں یا چوروں کی طرح لوگوں کے گھروں کو لوٹ لیں یا لوگوں کو قتل کر دیں یا اغواء کر لیں۔علاوہ ازیں حکومت نے ہر طرح سے کرپشن، نااہلیت اور پیسوں کا غبن کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اپنے پسندیدہ افراد پر کرامات کی بارش کر دی ہے۔منصوبہ خواہ کسی قسم کا ہی کیوں نہ ہو اس کے نفاذ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد ایک ہی طرح کے مخصوص لوگوں کو پہنچتے ہیں۔

ان ماہرین معاشیات کو ہمیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ لٹیری حکومت کے ساتھ عوام کے اشتراک کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ کیا حکومت ایسی ایجنسیاں بنائے گی مثلاً پی آئی پی ایس یعنی پاکستان انسٹیٹیوٹ فار پارٹیسپیسٹری سٹڈیز (Pakistan Institute for Participatory Studies) یا ایس پی سی (State Participation Corporation) اور دوسری حکومتی ایجنسیوں کی طرح یہاں بھی باس (جاگیردار) ہوں گے' کاریں' باس لوگوں کے لئے سہولیات' سجے سجائے دفاتر' ریسٹ ہاؤسز وغیرہ جوان ایجنسیوں کے پاس استعمال کریں گے۔ اس طرح تھوڑے بہت وسائل جو شرکاء کے ٹیکسوں سے مہیا ہونگے وہ ان سہولتوں کی فراہمی پر خرچ ہو جائیں گے۔ تب اشتراک کا کیا ہوگا؟ شاید وہی کچھ جو پچھلے کئی برسوں سے تعلیم کے ساتھ ہو رہا ہے خصوصا اس وقت سے جب سے تعلیم کے محکمے اور یونیورسٹیوں کی انتظامیہ اس قدر وسیع ہوگئی ہے اور محکمہ صحت یا خاندانی منصوبہ بندی کے شعبوں میں بھی تو یہی کچھ ہی ہوا جبکہ ان شعبہ جات پر بہت زیادہ پیسہ خرچ ہوا۔

یہ حضرات شاید ہمیں یہ بھی بتا سکیں کہ 49 برسوں کے دوران حکومت کی مسلسل ناکامی کے بعد بھی ہم پر یہ واضح کیوں نہیں ہو رہا کہ حکومت کچھ کرنے کے قابل نہیں؟ اور ایسا کیونکر ہوا کہ یکا یک حکومت اب عوام کے ساتھ اشتراک کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے۔ کیا ہمیں اس پر شک نہیں کرنا چاہئے کہ حکومت اور اس کے ٹھگ حواری اس اشتراک کو اپنے ہی فائدے کے لئے استعمال کریں گے؟ اور وہ عوام کے پیسے ہتھیا کر مزید امیر ہو جائیں گے اور عوام پر قرضوں اور مصائب کا بوجھ دو چند ہو جائے گا کیا ہم لٹیرے یا درندے سے مہربانی یا رحم کی امید رکھ سکتے ہیں؟

اگر چہ یہ ماہرین معاشیات اس سے اتفاق نہ کریں لیکن اب وقت آن پہنچا ہے کہ لوگ حکومت کے اضافی کردار کو چیلنج کریں یہ وقت لٹیرے کو اس کے دانتوں سے محروم کرنے کے لئے نہایت مناسب ہے۔ اگر حکومت سے ہماری زندگیوں میں مداخلت کرنے کے اختیار کو چھین لیا جائے تو وہ پیسوں کا غبن اور لوٹ مار نہیں کر سکے گی۔ شاید مذکورہ بالا ڈاکٹر اس ضمن میں ہماری مدد کر سکیں اور حکومت کے کردار کو کم سے کم کرنے میں عوام کی مدد کریں۔ کئی ایک حکومتی محکموں کو بند کر دینے سے حکومت کے کردار میں کافی کمی واقع ہو جائے گی اگر یہ ڈاکٹر حضرات ایسا نہیں کر سکتے تو ہمیں کوئی ایسا طریقہ بتا دیں کہ ہم شیر یا آدم خور درندے کے ساتھ ایک ہی پنجرے میں رات گزار سکیں۔

(11)

حکومت پاکستان: لغزشوں کا ایک تماشہ!

گزشتہ ہفتے حکومت پاکستان خارجہ پالیسی کو بین الاقوامی منڈیوں سے حصول سرمایہ کے ساتھ لازم وملزوم کرنے کی اپنی تازہ ترین کوششوں کے ضمن میں ہمارے لئے سیاسی طنز ومزاح کا ایک اعلیٰ نمونہ مہیا کیا۔ یہ تو خدا کا شکر ہوا (شاید حکومت کو خدا کا شکر زیادہ خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنا چاہئے) کہ 1992ء کے کرکٹ ورلڈ کپ میں پاکستان کی فتح کے جوش وخروش میں لوگوں کی توجہ اس جانب مرکوز نہ ہوسکی۔

آیئے ان حکومتی کوششوں کا جائزہ لیں! 1992ء کے دوران 16 مارچ کو سوموار کے دن اور 17 مارچ کو منگل کے دن ''دی وال سٹریٹ جرنل'' میں ایک اشتہار شائع ہوا یہ اشتہار سٹیٹ بنک آف پاکستان کی طرف سے تھا اور اس کے ذریعے سے حکومت کے فارن ایکسچینج سرٹیفکیٹس کی فروخت مطلوب تھی! میرے خیال میں ان سرٹیفکیٹس کی فروخت میں کوئی مذائقہ نہیں اور ممالک نے بھی ضرورت پڑنے پر ایسا کیا ہے اس لئے اس اشتہار پر کسی کو تعجب نہ ہوا۔

لیکن بدقسمتی سے یہ اشتہار جو سرکاری نوعیت کا لگ رہا تھا اس میں یہ بیان جلی حروف میں درج تھا ''رقم کے حصول کے ذرائع سے متعلق کسی قسم کا کوئی سوال ہرگز نہ کیا جائے گا'' اور ''نہ ہی شناخت کے بارے میں استفسار کیا جائے گا۔'' اس قسم کے بیانات کی البتہ پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ کسی بھی ملک نے بین الاقوامی منڈیوں سے حصول سرمایہ کو ممکن بنانے کے لئے اس طرح کے بیانات اس قدر جلی حروف میں کبھی نہیں چھپوائے۔ حتیٰ کہ کالے دھن کو سفید کرنے والے سب سے بڑے ملک سوئٹزرلینڈ نے بھی ایسا کبھی نہیں کیا۔

ان حالات میں ان حضرات کی اہلیت سے متعلق مختلف سوالات کئے جاسکتے ہیں جو سٹیٹ بنک آف پاکستان، ہمارے دفتر خارجہ، سفارتخانے اور وزارت خزانہ میں کام کرتے ہیں۔ کیا ان سب میں سے کوئی بھی جو کہ ان ایجنسیوں میں کام کرتے ہیں اس قسم کے بیان کی غیر معقولیت اور ناشائستگی

سے آگاہ نہیں کیا یہ تمام ایجنسیاں اس قسم کا کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ نہیں کرتیں! اور وہ غیر ملکی مشیران کرام اس وقت کہاں تھے مثلاً نیل اینڈ کوگل اینڈ مارک سیگل وغیرہ! اس طرح کے واقعے کے بعد ان کے معاوضوں کو کیسے حق بجانب قرار دیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ کہانی یہیں پر اختتام پذیر ہو جاتی تو بھی اس کہ مضحکہ خیزی قابل برداشت تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ وال سٹریٹ جرنل نے اس اشتہار کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی اس سلسلے میں اس جرنل کی انتظامیہ نے سٹیٹ بنک اور پاکستانی سفارتخانے سے رابطہ کیا۔ صورتحال مزید مضحکہ خیز اس وقت ہوئی جب سٹیٹ بنک کے ایک آفسر نے جرنل کے نمائندے کو کسی تکلف کے بغیر یہ بتا دیا کہ حکومت کالے دھن کو سفید بنانا چاہتی ہے یعنی کرنسی کی دھلائی کا کام کرنا چاہتی ہے۔ اپنی اس گفتگو کے دوران وہ صاحب اس قدر جوش میں آئے کہ انہوں نے جرنل کے نمائندے سے یہ بھی کہہ دیا کہ ''اب تو تم سمجھ گئے ہو گے'' بعد میں سفارتکانے کے ایک افسر نے یہ بھی کہہ دیا حکومت پاکستان ان رقوم کے بارے میں جو امریکہ سے لے جائی جائیں گی امریکہ کے فیڈرل ریزورکو قطعاً علم نہ ہونے دے گی۔ اور جو پاکستانی حکومت بانڈ جاری کرے گی اسے وائیٹنر بانڈ (Whitener Bond) کہا جائے گا۔ اب یہ کہنا تو بجا ہو گا کہ سفارخانے کا ایک افسر اس قانون سے قطعاً نابلد تھا جس کا اندراج امریکہ میں داخلے کے وقت مطلوب کسٹمز کے فارم پر بھی ہوتا ہے کہ دس ہزار ڈالر سے زائد رقم کی منتقلی کی اطلاع پہلے امریکہ کے فیڈرل ریزو کو دی جائے گی۔

پھر کئی سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں کیا ان افراد کو ایسے انتہائی احمقانہ بیانات جاری کرتے وقت کسی بااختیار ادارے کی طرف سے کلیرنس ملی ہوتی ہے جن کے باعث نہ صرف خارجہ تعلقات متاثر ہوتے ہیں بلکہ بین الاقوامی مالیاتی منڈیوں میں ہمارا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔ اور کیا ہمارے بیوروکریٹس اور دیگر افسران کو یہی تربیت دی جاتی ہے کہ جو منہ میں آئے کچھ سوچے سمجھے بغیر پھٹ پڑیں۔ انہوں نے متعلقہ اداروں سے پتہ کرنے کے بعد وال سٹریٹ جرنل کو تیار شدہ بیان جاری کیوں نہیں کیا؟ اور اپنے احمقانہ برتاؤ کی ان حضرات کو کوئی قیمت بھی دینا پڑتی ہے یا نہیں؟ یا ہماری حکومت غلطیوں کی سزا دینے کی قائل ہی نہیں۔

ہمارے خطیر رقوم حاصل کرنے والے اعلی پائے کے پیشہ ور ماہرین کی حماقتوں کے سبب ساری دنیا پاکستانی حکومت کو ''کالا دھن صاف کرنے والی حکومت'' کہہ رہی ہے۔ جبکہ کانگرس اور سینٹ جو ہمارے بارے میں پہلے سے منفی خیالات رکھتی ہیں ان کے خیالات ایسے غیر ذمہ دارانہ

برتاؤ کی وجہ سے پختہ تر ہو گئے ہیں۔ایسی صورتحال میں ہمارے پیشہ ور ماہرین نے چپ سادھ لی ہے۔ہمارے اکثر سفارتخانوں کو چاہئے تھا کہ وہ جرنل میں ایڈیٹر کے نام خطوط لکھتے اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ اس اشتہار کا یہ مطلب نہیں جو کہ سمجھا گیا ہے تا کہ بگڑی ہوئی صورتحال میں کچھ تو بہتری پیدا ہوتی۔لیکن ہمارے سفارتخانوں کے تو کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔تمام بھاری فیسیں وصول کرنے والے منتظمین و ماہرین اس وقت حرکت میں آئے جب وال سٹریٹ جرنل نے اس اشتہار کا نوٹس لیا۔

بعد میں 24 مارچ 1992ء کو واشنگٹن پوسٹ میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کی طرف سے ایک اور اشتہار چھپا جس میں درج تھا کہ واشنگٹن میں پاکستان کے سفارتخانے نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کو بتایا ہے کہ سیکوریٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن کی اجازت کے بغیر امریکی منڈی میں سیکورٹیز جمع نہیں کرائی جاسکیں۔اس لئے سٹیٹ بنک اب اپنا یہ اشتہار (جو قبل ازیں وال سٹریٹ جرنل میں شائع ہوا تھا) واپس لیتا ہے۔

عزیز قارین! ہم محض اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کہ سٹیٹ بنک نے اشتہار دینے سے پہلے سفارتخانے سے اس موضوع پر تبادلہ خیال کیوں نہ کیا۔کیا سٹیٹ بنک نے سفارتکانے سے اس بارے میں پوچھنا گوارا ہی نہ کیا اور نہ ہی اپنے مشیروں سے؟ اور سفارتخانے کے افسر کیطرف سے جاری کئے جانے والے بیان کی کس قسم کی توجیہ ممکن ہے جس کے مطابق فیڈرل ریزوکو رقم کی منتقلی کے بارے میں حکومت پاکستان بتانے کی پابند نہ ہوگی! اس بیان کی روشنی میں آپ اس اشتہار کے بارے میں کسی قسم کا تبصرہ کر سکتے ہیں جو بعدازاں واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہوا تھا۔کیا سفارتخانے اور سٹیٹ بنک کو اب پتہ چلا تھا کہ کسی بھی ملک میں بانڈز کی فروخت سے قبل وہاں کی حکومت سے نوٹیفیکیشن اور باقاعدہ اجازت کی ضرورت ہوتی ہے؟ کیا خود سٹیٹ بنک آف پاکستان حکومت پاکستان کی اجازت کے بغیر کسی بھی ملک کو پاکستانی اخبارات مثلاً جنگ وغیرہ میں اس طرح کا اشتہار شائع کروانے کی اجازت دے گا''؟

بدقسمتی سے یہ ٹیلی ویژن پر مزاحیہ شو نہ تھا بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی جسے کافی عرصے تک پورے پاکستان کو برداشت کرنا پڑے گا۔یس منسٹر اور مونٹی پائتھن کی طرح یہ مضحکہ خیزی سے بھرپور شاہکار ہوگا۔اور بہت ہی بڑے سیاسی وادبی شاہکار Kafkaesque کی طرح مزیدار بھی مگر یہ سب تو محض افسانوی چیزیں ہیں لیکن ہماری حکومت نے جو کچھ کیا وہ مزاح۔دلچسپی اور مضحکہ

خیزی میں ان تمام سے کم ہرگز نہیں اور پھر یہ افسانوی نہیں بلکہ حقیقت تھی۔

اس واقعے سے ہمیں حکومت کی کارکردگی اور طرز عمل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حکومتی ایوانوں میں افراتفری کا یہ عالم ہے کہ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کا پتہ نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اب تو یہ کہنا بھی محض تکلف ہی ہے کہ ہماری حکومت مکمل طور پر دیوالیہ ہو چکی ہے اور یہ کسی بھی معاملے کو سلجھانے کی اہلیت سے بالکل محروم ہو چکی ہے۔ ہمیں اس سے ایسی امید قطعاً نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ اس واقعے کی تحقیقات کرائے گی جس کے خارجہ پالیسی پر سنگین اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اور یقیناً ان افراد پر جو اس واقع کے ذمہ دار ہیں کسی قسم کا حرف ہرگز نہ آئے گا۔

اس وقت ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ حکومتی محکمے اور اہلکار سمجھتے ہیں کہ جیسے وہ خدائی کے درجے پر فائز ہیں اور سنگین سے سنگین غلطی بھی ان کے لئے معمولی بات ہے۔ ہماری حکومت کی مشینری ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے مناسب اقدامات کرنے پر قطعاً یقین نہیں رکھتی۔ اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ ہمارے حکومتی اہلکاروں کی قابلیت کا معیار اس قدر کم تر درجے پر پہلے کبھی نہ تھا جتنا کہ اب ہے۔

جہاں تک اس اشتہار کی بات ہے تو سرکار کا جو وقت اور پیسہ اس پر برباد ہوا اگر اس کا صحیح اندازہ لگایا جائے تو سرکاری خزانے سے دس لاکھ ڈالر سے زائد کی رقوم یقیناً خرچ ہوئی ہوگی جبکہ بین الاقوامی مالیاتی منڈیوں میں جو پاکستان کی ساکھ کو نقصان پہنچا ہوگا وہ اس سے زیادہ ہے کیونکہ قرض دینے والے پاکستانیوں کو پیسہ دیتے ہوئے ہچکچاہٹ کا اظہار کریں گے اور اسے بہت بڑا رسک گردانیں گے چنانچہ جاری کئے جانے والے قرضہ جات پر منافع کی شرح میں اضافہ یقیناً ہوگا لیکن ہماری حکومت کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اس طرح کے ملکی نقصانات عوام کی نظروں سے چھپے ہوتے ہیں اور جن سے سیاسی طور پر اس لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔

میرے خیال میں اب موزوں ترین وقت ہے کہ حکومت سے کہا جائے کہ ''اپنے آپ کا علاج کرو'' ہم ایسی حکومت سے موزوں پالیسی مرتب کرنے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں جو اشتہار شائع کروانے جیسے معمولی سے مسئلے سے بھی نبرد آزما ہونے کی اہلیت سے محروم ہے۔ ایسی حکومت ہماری معیشت کو کیسے سنوار سکتی ہے اور ہمارے وسائل کو بہتر طور پر کیونکر کام میں لا سکتی ہے۔ شائد مناسب وقت آن پہنچا ہے کہ ہم اپنے قرض داروں سے کہیں کہ اس قدر نا اہل اور کرپٹ حکومت کو قرض نہ دیں۔

(12)

حکومتی ادارے یا جاگیریں

گو کہ بہت دیر بعد لیکن پھر بھی! سرکاری شعبے (Public Sector) کی نااہلی اور بیکاری کو ہر کسی نے تسلیم کر لیا ہے۔ لہذا نجکاری کا عمل شروع کر دیا گیا ہے۔ اور حکومت اب اپنے آپ کو پیداواری عمل میں براہ راست طور پر شریک نہ کرنے میں پرعزم لگتی ہے۔ چنانچہ بیکاری اور نااہلی کے خاتمہ کی طرف نمایاں پیش رفت کی گئی ہے۔

لیکن ابھی بہت کام باقی ہے۔ گو کہ یہ عمل شروع تو ہو گیا ہے لیکن ابھی حکومتی نااہلی اور بیکاری کو مکمل طور پر ختم کرنے کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ اس وقت ہمیں سرکاری شعبے کی تمام کارپوریشنوں کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرنا چاہئے تا کہ ان کارپوریشنوں کی نشاندہی کی جا سکے جو نااہل ہیں اور پیسے کے ضیاع کے علاوہ اور کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ تا کہ ان کی نجکاری کی جا سکے۔ البتہ سب کی سب کارپوریشنوں کی نجکاری سے پرہیز کرنا چاہئے بہرحال ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ نااہل کارپوریشنوں کو بند کر دینے یا ان کی نجکاری کرنے کا بہادرانہ فیصلہ کیا جائے گا یا نہیں؟

ایسا ہی ایک شعبہ جو نااہلی اور بیکاری میں یکتا ہے اس شعبے میں حکومت کے تحت چلائے جانے والے نام نہاد انسٹیٹیوٹ ہیں جو تحقیق، کلچرل اور ادبی سرگرمیوں کی ترقی کے لئے شروع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح بعض تعلیمی ادارے بھی نااہلی میں ان کی ہمسری کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان اداروں سے متلق ہمارے پاس تفصیلی اعداد و شمار نہیں ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ عوام کے ادا کردہ ٹیکسوں کا کس قدر حصہ یہ ادارے کھا پی جاتے ہیں اور کیا یہ کچھ کام بھی کر رہے ہیں یا نہیں۔ البتہ خالی اندازوں کے بل بوتے پر ایک عمومی خاکہ بنایا جا سکتا ہے جس سے ان اداروں پر ضائع کئے جانے والے وسائل کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں کم از کم 150 اکڈمک ریسرچ کے ادارے موجود ہیں جن پر زیادہ نہیں تو ایک کروڑ روپیہ فی ادارہ سالانہ خرچ آتا ہے۔اس طرح ان اداروں پر ہر سال 150 کروڑ روپے کے اخراجات ہوتے ہیں۔ان اداروں کے علاوہ کم از کم 8 ثقافتی وادبی ادارے بھی قائم ہیں جن پر بھی ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے برابر ہی خرچ آتا ہے چنانچہ ثقافتی و ادبی ادارے بھی 8 کروڑ روپے سالانہ خرچ کرتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس قدر خطیر رقم خرچ کرنے کے بعد وہ کیا تخلیق کر رہے ہیں۔اس میں تو کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ علم ونصاب کے شعبے کی طرف ہم نے ماضی میں کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی اس کے بارے میں سنجیدگی سے کبھی سوچا۔نتیجتاً پاکستانی ماہرین علم ونصاب کی تعداد بہت قلیل ہے اس میں سے بھی زیادہ تر بیرون ملک خدمات سرانجام دے رہے ہیں اس لئے اندازہ یہی ہے کہ کسی بھی علمی شعبے یا مضمون میں سنجیدہ ماہرین کی تعداد انتہائی کم ہے کہ جو کسی تحقیقی ادارے میں تحقیق و تدوین کا کام موثر انداز سے کر سکیں۔اس کے باوجود ہر شعبہ علم سے متعلق ہمارے ہاں کئی کئی تحقیقی مراکز قائم ہیں۔ان میں سے 10 ادارے تو صرف اقتصادیات سے متعلق ہیں جبکہ 3 دیہی یا زراعت کے شعبوں سے متعلق تقریباً 6 بین الاقوامی تعلقات سے متعلق! علاوہ ازیں ریجنل سٹڈیز اور سٹریٹیجک سٹڈیز کے ادارے علیحدہ ہیں۔کئی تحقیقی مراکز ان کے علاوہ بھی ہیں۔

پاکستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد 20 سے بھی زیادہ ہے۔ان میں سے ہر ایک میں وہ شعبے بھی قائم ہیں جن کے لئے پورے کا پورا تحقیقی مرکز علیحدہ سے قائم ہے۔ان یونیورسٹیوں کے بجٹ خطیر رقوم پر مشتمل ہوتے ہیں جبکہ ان یونیورسٹیوں کا حاصل یعنی ان سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء وطالبات بہت ہی کم تر علمی معیار کے ہوتے ہیں۔لیکن یہ اور کہانی ہے!

اپنے نقطے کی وضاحت کے لئے میں سماجی علوم (Social Sciences) کی مثال سامنے رکھوں گا کیونکہ یہ ایسا شعبہ علم ہے جس کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے پاکستان میں تقریباً سماجی علوم سے متعلق 15 تحقیقی مراکز قائم ہیں۔دو مزید تحقیقی ادارے قائم کئے جا رہے ہیں جو اقتصادیات اور اس سے متعلق علوم کے بارے میں تحقیقی کام سرانجام دیں گے۔20 کے قریب یونیورسٹیاں علیحدہ ہیں جہاں سماجی علوم کی تعلیم و تدریس جاری ہے۔امریکی یونیورسٹیوں کے مشاہدے سے مجھے پتہ چلا کہ کسی بھی شعبہ علم کو موثر طور پر چلانے کے لئے انہیں کم از کم 20 کے قریب تجربہ کار فیکلٹی کے ممبران کی ضرورت ہوتی ہے جن کے تحقیقی مقالہ جات

بین الاقوامی معیار کے تحقیقی جرائد میں مسلسل چھپتے ہوں امریکہ میں قائم تحقیقی مراکز کو بھی اتنی ہی تعداد میں تجربہ کار محققوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اب آیئے فرض کرتے ہیں کہ وہ تحقیقی مراکز جو سماجی علوم میں تحقیقی کام کے لئے قائم کئے گئے ہیں (سماجی علوم کئی شعبہ ہائے علم پر مشتمل ہوتے ہیں) ان مراکز میں 10 ماہرین اقتصادیات کی ضرورت ہے جو دراصل مرکز کی اصل ضرورت کا نصف ہے۔ اس سے ہمیں یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ ان تحقیقی مراکز میں تربیت یافتہ ماہرین علم کی کس قدر ضرورت ہے۔ جب ہم ماہر محققوں کی بات کرتے ہیں تو ان سے ہماری مراد وہ افراد ہوتے ہیں جن کے تحقیقی مقالات مغرب و امریکہ کے جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ان 20 یونیورسٹیوں اور 15 تحقیقی مراکز کے سماجی علوم کے شعبوں میں 550 اعلی پائے کے محققین و اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ سماجی علوم میں چونکہ اقتصادیات، عمرانیات، سیاسیات اور علم الانسان کو شامل کیا جاتا ہے چنانچہ ہمیں 2200 اعلی پائے کے سوشل سائنسدانوں کی ضرورت ہوگی جو یونیورسٹیوں کے شعبوں اور تحقیقی مراکز میں اپنا اپنا کام کر سکیں۔

ان اعداد و شمار کے ساتھ جب میں لائبریری گیا اور پاکستانی ماہرین سماجی علوم کے بارے میں جاننے کے لئے مختلف تحقیقی جرائد پر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ پچھلے 5 برسوں میں صرف 20 پاکستانی لوگوں کے مقالے ان جرائد میں شائع ہوتے تھے۔جن میں سے 15 پاکستان سے باہر رہائش پذیر تھے اور ہمارے نصابی و تحقیقی اداروں سے ان میں سے کوئی ایک بھی متعلق نہ تھا۔اس سے ہم اس فوری نتیجے پر با آسانی پہنچ سکتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی و تحقیقی اداروں میں یا یونیورسٹیوں میں ایک بھی ماہر سماجی سائنسدان نہیں۔

اگر ہم سماجی علوم جیسے عمرانیات، علم الانسان اور اقتصادیات وغیرہ کے جزئیاتی علوم پر غور کریں تو صورتحال اس سے بھی زیادہ مخدوش نظر آئے گی۔ ہر شعبے میں ان جزئیاتی علوم کے ماہرین کی ضرورت ہوگی اور اگر اوپر بیان کئے گئے اعداد و شمار کو ان سماجی علوم اور پھر ان سے متعلق جزئیاتی علوم پر بھی لاگو کیا جائے تو ماہرین کی اوپر دی گئی تعداد سے بھی کہیں زیادہ تعداد مزید درکار ہوگی۔

ان اداروں کی کارکردگی سے بھی ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر ادارے کا باس اپنی شہرت کا متمنی نظر آتا ہے۔ جب ان اداروں کو بجٹ میں بہت زیادہ رقوم دے دی جاتی ہیں اور بعد میں پوچھ گچھ نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ باس اپنے ذاتی اخراجات پر بہت سی رقم ضائع کر دینے کا اختیار رکھتا ہے اور ایسا کرنے سے بالکل نہیں گھبراتا اور اس قسم کے اداروں سے جو مواد شائع

ہوتا ہے اس میں معیار یاSubstance نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی وہاں جو کچھ بھی چھپتا ہے اس ادارے کے باس کا نام اس پر سب سے پہلے لکھا جاتا ہے۔ ایک سکالر نے جسے ایک اہم تحقیقی انسٹیٹیوٹ میں کام کرنے کا موقع ملا تھا مجھے بتایا کہ اس نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور جب اسے انسٹیٹیوٹ کی طرف سے شائع کیا گیا تو مصنف کے طور پر باس کا نام پہلے درج تھا اور اصل لکھنے والے کا اس کے بعد میں!

باس عام طور پر اپنی شہرت پر پانی کی طرح پیسہ بہاتے ہیں وہ بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں ان کے انعقاد کا مقام فائیو سٹار ہوٹل ہوتے ہیں جہاں وزیراعظم یا صدر ان کانفرنسوں کا افتتاح کرتا ہے۔ جس سے باس کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ غیر ملکی اہم شخصیات کو ان کانفرنسوں میں مدعو کیا جاتا ہے اور انہیں غیر معمولی عزت واحترام دیا جاتا ہے جس سے باس کو بے انتہا طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

وہ محقق جوان اداروں میں کام کرتے ہیں اس بات کا پہلے ہی سے علم ہونا چاہئے کہ ان کا ایک ہی فرض ہے اور وہ ہے اپنے باس کی دل و جان سے خدمت کرنا۔ یہ بیان سٹریٹیجک سٹڈیز میں فارغ التحصیل ایک نوجوان سکالر کا ہے جس نے ایسے اکیڈمک اداروں میں سے ایک میں کام کیا ہوا ہے۔ اس کے مطابق ان اداروں کے تمام ملازمین کے باس کا برتاؤ ایسا ہوتا ہے جیسے یہ سب اس باس کے مزارعین ہوں۔ ادارے کو چلانے میں ان سے کسی قسم کا مشورہ لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ اور نہ ہی ان کے لئے ایسا کوئی ذریعہ ہے کہ وہ باس کے آمرانہ رویے کے خلاف کوئی شکایت درج کرواسکیں۔

ایک خاتون نے جو عمرانیات کی سکالر ہے ان تحقیقی مراکز کو جاگیروں سے تعبیر کیا۔ جیسے پرانے زمانے کے بادشاہ اپنے پسندیدہ لوگوں کو یا بعض افراد کی حمایت حاصل کرنے کے لئے جاگیریں عطا کیا کرتے تھے اسی طرح حکومت پاکستان ان اداروں کو سیاسی وفاداری کے صلے میں یا رشوت کے طور پر مختلف لوگوں کو عطا کرتی ہے۔ عام طور پر کوئی ریٹائرڈ افسر یا کسی اہم سیاسی شخصیت کو ان اداروں کا انچارج بنا دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسے اداروں کو اپنے کسی پسندیدہ شخص کو جاگیر عنایت کرنے کی غرض سے قائم کیا جاتا ہے۔ اور ایک دفعہ جب نوکری دے دی جاتی ہے سالانہ رقوم مختص کر دی جاتی ہیں اور ان رقوم کو باس کے حوالے کر دیا جاتا ہے ان رقوم کا بعد میں کبھی حساب نہیں لیا جاتا۔ اس طرح باس کو ان گنت سہولتیں میسر آ جاتی ہیں جیسے معاشرے میں مقام۔ ایک گھر' کار'

نوکر تمام بلوں کی ادائیگی ادارے کی جانب سے اور اس کے علاوہ وسیع بجٹ جس میں ہیرا پھیری کے ذریعے جس قدر رقم چاہئے ہو باس کے لئے اس کا حصول کوئی مشکل نہیں۔ اپنے انسٹیٹیوٹ کے اندر وہ ایک ڈیوک یا جاگیردار سے کم ہرگز نہیں۔ اپنی اس جاگیر میں وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو اس کی منشاء اور مرضی ہو جب تک وہ اس وقت کی حکومت کو ناراض نہ کر بیٹھے۔

پچھلے کئی برسوں میں ایسے اداروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ ان اداروں بلکہ ان اداروں کے باس بڑی بڑی مختص رقوم کے بل بوتے پر کافی پروان چڑھے ہیں۔ اکثر سنجیدہ قسم کے ماہرین علم اور محققین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان اداروں میں کسی قسم کا کوئی سنجیدہ کام سرے سے ہوا ہی نہیں پھر نہ جانے کیوں انہیں اس قدر بڑی رقوم دے دی جاتی ہیں جن کا کوئی جواز نہیں۔ ان اداروں کی تنظیم سخت گیر اور آمرانہ نوعیت کی ہوتی ہے جس میں تحقیقی کام کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ لمبی مدت تک ادارے سے وابستگی اور ادارے کے باس کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ حیرانی کی بات یہ بھی ہے کہ کوئی بھی ان اداروں کے مالی امور کی طرف دھیان نہیں دیتا نہ ہی یہ دیکھتا ہے کہ یہ ادارے کیا کام کر رہے ہیں اور ان کی افادیت کیا ہے نہ ہی ان علمی، ثقافتی اور دیگر اداروں کے باسوں سے استفسار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ضیاع پر اخباروں کی خاموشی بھی حیرانی کا باعث ہے۔

III۔ پریس اور حکومتی کردار

(13)

صحافت! ایک تجزیہ

پچھلے چند برسوں سے صحافت کو بظاہر آزادی دی گئی ہے جس کی وجہ سے بہت سے اخبارات اور میگزین منظر عام پر آئے ہیں اہم بات یہ ہے کہ ان اخبارات و جرائد کے عمومی معیار میں غیر معمولی بہتری دیکھنے کو آئی ہے۔ مگر وہ مسائل جن کا عوام کی زندگی سے گہرا اور براہ راست تعلق ہوتا ہے ان مسائل میں یہ اخبارات بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔ تب حیرانی ہوتی ہے کہ آزادی میسر آنے کے بعد صحافیوں کو یہی کچھ کرنا چاہئے جو وہ آجکل کر رہے ہیں۔ شاید جن قوتوں نے صحافت کی آزادی کو ممکن بنایا ہے انہوں نے پریس کو یہ تنبیہہ ضرور کی ہوگی کہ وہ زیادہ حساس موضوعات پر قلم اٹھانے سے گریز کرے۔ اس طرح آزادی کے باوجود پریس کو موجودہ نظام اور طبقہ امراء کے تابع کر دیا گیا ہے جس سے وہ شاذ و نادر ہی بغاوت کرتا ہے۔

میں نے پریس کو یہ الزام دیا ہے تو آیئے اس الزام کے حق میں دلائل دیتے ہوئے پریس کی ترجیحات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ میڈیا میں سب سے زیادہ جگہ یا تو حکومت کی پریس ریلیز کو دی جاتی ہے یا معمولی تعلیم یافتہ' اپنی ہی نوعیت کے جاگیردار سیاستدانوں کے احمقانہ بیانات کو! جبکہ ان جاگیردار سیاستدانوں میں قطعاً کوئی خوبی سرے سے ہے ہی نہیں سوائے اس کے کہ ان کے آباؤ اجداد نے انگریزوں کی دل و جان سے خدمت کی۔ مثال کے طور پر ایک ہی طرح کی شہ سرخی بار بار اخبارات کی زینت بنتا دیکھ کر انسان تنگ آ جاتا ہے جس میں ایک سیاستدان دوسرے کو گالی گلوچ سے نوازتا ہے بجائے اس کے کہ وہ اہم پالیسیوں یا مسائل پر اپنا نقطہ نظر واضح کرے۔ کوئی سیاستدان اگر پریس کانفرنس طلب کر لے یا ایسی پارٹی بنا لے جس کی عوامی رکنیت سرے سے ہی ہو نہیں تو اخبار کے صفحہ اول پر اس کا ذکر آنا لازمی ہو جاتا ہے۔ شاید اب وقت آ گیا ہے کہ ان حضرات اور ان حضرات کے بیانات کو اخبار کے آٹھویں صفحے کے سب سے نچلے کونے کے لئے مخصوص کر دیا جائے

تا کہ سیاستدانوں کو بھی پتہ چلے کہ اخبار کے صفحہ اول پر ان کی تصویر اور بیانات کا آنا ان کا پیدائشی حق نہیں اور نہ ہی یہ اس جاگیر کی طرح ہے جو انہیں اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کی خدمت کے صلے میں ملی تھی۔ ان لوگوں کو یہ حق اسی صورت میں مل سکتا ہے اگر وہ کوئی کام کی بات کریں وگرنہ انہیں ہمارا قیمتی وقت برباد کرنے کا کوئی حق نہیں۔

اگر تجزیاتی سطح پر جائزہ لیا جائے۔ ہمارے دانشوروں اور میڈیا کے سرکردہ حضرات کے لئے بڑے مسائل جو عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں زیادہ کشش رکھتے ہیں۔ یہ خاصیت زیادہ واضح طور پر نہ صرف پرانی سول سروس سے متعلقہ افسروں میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی بلکہ یہ انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی نظام کی وجہ سے ہماری صحافیانہ روایات میں بھی در آئی ہے ہمارے ہاں پڑھے لکھے طبقہ امراء کا میلان بھی اسی طرح کا ہے کہ وہ پرانے وکٹورین افراد کی طرح کلاسیکی علوم وفنون سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں اور کسی مخصوص فن میں مہارت پیدا کرنے یا تکنیکی علم حاصل کرنے سے گھبراتے ہیں جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ عمومی نوعیت کے بڑے مسائل مثلاً امور خارجہ وغیرہ عمومی سیاست یا چیدہ چیدہ آئینی مسائل پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے چنانچہ ہماری فارن پالیسی کیسی ہونی چاہئے یا آئینی مسائل کے بارے میں ہمارے نقطہ نظر کیا ہونا چاہئے ایسے معاملات کے بارے میں آپ کو لاتعداد تجزیے اخبارات کی زینت بنے دکھائی دیں گے۔ ادارتی صفحہ یا تجاویز کے صفحے پر ایسے ہی تجزیوں کو ترجیحاتی بنیادوں پر جگہ دی جاتی ہے۔

ان دونوں شعبہ جات کو اخبار میں جگہ دے دینے کے بعد ایڈیٹر اپنے طبقہ اعلیٰ کے قارئین کی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر کافی مقدار میں ادبی مواد چھپتا ہے۔ جس میں ادبی مضامین یادداشتیں۔ کچھ تجزیے خاص طور پر اقبال یا فیض پر۔ اس طرح کے مواد سے ادبی صفحے کی ضرورت خاصی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔ دقیق قسم کے ادبی مسائل سے متعلق تحریریں بھی اخبارات میں قبول کر لی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''دی نیشن'' کے ادارتی/تجاویز کے صفحے پر بہت ہی گنجلک قسم کے ادبی نظریئے ''ڈی کنسٹرکشن ازم'' کے بارے میں کافی سارے مضامین چھپتے رہے۔ شاید دقیق قسم کی شاعری اور گنجلک ادبی نظریات کی ترویج سے ہی 95 فیصد پاکستانیوں کے معاشی مسائل حل ہو جائیں۔

اور پھر طبقہ امراء کی تفریح طبع کے لئے ایک اور سامان جو ہمارا میڈیا تسلسل کے ساتھ مہیا کرتا ہے وہ ہے مغربی طرز کے فیشن جو بڑی تعداد میں رنگین تصاویر کے ذریعے قارئین تک پہنچائے

جاتے ہیں۔اس کے بعد آرٹ بھی اسی نوعیت کی شے ہے!اگر آپ ہیرلڈ یا نیوز لائن پر نظر دوڑائیں تو آپ کو یوں لگے گا جیسے یہ پاکستان نشاۃ ثانیہ کے دور کا ملک ہو ان جرائد کے حالیہ شماروں میں تقریباً 20 فیصد جگہ ''آرٹ'' کے لئے مختص ہوتی ہے۔اور اس میں میاں اعجاز الحسن کی کتاب پر جو لاتعداد خطوط چھپتے ہیں ان کا تو ذکر ہی نہیں۔ یہ سب اس لئے ہے کہ اس طرح کے فیشن سے مرصع کپڑے طبقہ امراء کے لوگ پہنتے ہیں اور آرٹ جو ان جرائد واخبارات میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے انہیں کے لیونگ رومز کی شان وشوکت میں اضافہ کرتا ہے۔ان تمام چیزوں کا عام آدمی اور اس کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔

اب اگر ان مسائل اور موضوعات کی نشاندہی کر دی جائے جن کا ذکر موثر طور پر پریس میں ہونا چاہئے تو کوئی مذائقہ نہ ہوگا۔ان مسائل وموضوعات پر خیال آرائی سے قبل آیئے پہلے طے کر لیں کہ بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں اور ہمارے بنیادی مسائل کیا ہیں کہ جن کا ذکر پریس کے لئے کرنا ضروری ہے۔میرے خیال میں سب سے بڑا مسئلہ جو ہمارے ملک کو درپیش ہے وہ غربت کا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ ہمیں تکنیکی میدان میں دنیا کے دوسرے ممالک کے برابر کیسے آنا ہے۔ہمیں غربت کے خاتمے اور تکنیکی میدان میں ترقی کے لئے سرتوڑ کوشش کرنی ہوگی اور اس کے لئے اگر ہمیں شاعری' آرٹ اور کرکٹ کو بالائے طاق ہی کیوں نہ رکھنا پڑے تو بھی ہمیں اس میں پس و پیش نہیں کرنی چاہئے۔

اگر تعلیم پر غور کیا جائے تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہماری بیشتر آبادی ناخواندہ ہے۔بالکل اسی طرح آبادی میں اسی تیزی سے ہونے والے اضافے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں نوجوانوں کا تناسب بڑھتا جارہا ہے۔بغیر مناسب تعلیم کے ہم غیر تربیت یافتہ مزدوروں کا جم غفیر پیدا کررہے ہیں جو کہ بین الاقوامی سطح پر مقابلہ کرنے کے اہل نہیں ہونگے جہاں مقابلے کی دوڑ بہت سخت ہے۔اگر اوسط درجے کے پاکستانی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تعلیم کی طلب میں اضافہ ہورہا ہے اور اس کے لئے مناسب پالیسی اور میڈیا کی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

لیکن طبقہ امراء کے لئے جو اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کیلئے باہر کے اداروں میں بھیجتے ہیں یہ مسئلہ بالکل اہم نہیں۔ان کے نزدیک یہاں کے غیر معیاری سکول اور یونیورسٹیاں مقامی عامتہ الناس کے لئے بہت کافی ہیں۔میڈیا کا نقطہ نظر بھی کم وبیش یہی ہے۔اعلیٰ معیار کے جرائد اور اخبارات میں تعلیم کے بارے میں ایک بھی مضمون نہیں چھپتا۔اور نہ ہی وہ متروک طرز تعلیم وتدریس

اور نصاب کے بارے میں کوئی آواز بلند کرتے ہیں۔ اسی طرح یونیورسٹیوں اور تحقیقی مراکز کو ذاتی جاگیروں کی طرح چلایا جاتا ہے اور ان کے منتظمین ایسے افراد ہوتے ہیں جن میں علمی میلان سرے سے ہوتا ہی نہیں پھر بھی میڈیا اس جانب توجہ نہیں دے رہا۔ سب سے اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ میڈیا اس پر بھی صرف نظر کئے ہوئے ہے کہ یہ تعلیمی مراکز مختص شدہ فنڈز کو کیسے استعمال میں لاتے ہیں اور اخراجات میں ان کی ترجیحات کیا ہیں۔ حتیٰ کہ امتحانات لینے میں بلاوجہ تاخیر اور یونیورسٹی میں محض انتظامی سہولت کے لئے چھٹیاں کر دینا جیسے مسائل بھی میڈیا کی دلچسپی حاصل نہیں کر سکے۔

میڈیا کی ایسی کارکردگی سے نہ معلوم اس ملک کا نوجوان طبقہ کس قسم کا تاثر لیتا ہے۔ شاید وہ اس سے یہی سیکھتے ہیں کہ شہرت اور دولت حاصل کرنے کے لئے (الف) سیاستدان بن جانا بہتر ہے جن کا ذکر اخبارات کی شہ سرخیوں میں ہوتا ہے اور ان کے احمقانہ بیانات ان کے صفحہ اول پر چھاپے جاتے ہیں۔ (ب) یا ادب، آرٹ اور کرکٹ کے پیشے سے وابستہ ہو جانا (ج) اپنے آپ میں عمومی یا فلسفیانہ سوچ کی ترویج جس میں تکنیکی پس منظر کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ چنانچہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ تعلیم کا حصول ہمارے نوجوانوں کی ترجیحات میں نچلے درجے پر آتا ہے۔

(14)

سوالات! جو کہ صحافیوں کو پوچھنے چاہیں!

کئی ایک وجوہات کی بنا پر ہمارے صحافی اور دانشور امور خارجہ اور کشمیر یا آئین سے متعلق عمومی معاملات پر ہی دانشورانہ آراء دیتے رہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہیں عام آدمی کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مثال کے طور پر سرکاری سرپرستی کا بڑھتا ہوا رجحان حکومتی سطح پر وسائل کا ضیاع اور روز افزوں اخراجات کی ترجیحات میں بہت نیچے آتے ہیں۔ اس بات کا کسی کو بھی احساس نہیں کہ ان تمام تر اخراجات کا بوجھ خواہ یہ اخراجات ترقیاتی ہوں یا غیر ترقیاتی! عام آدمی پر ہی پڑتا ہے جو کہ ٹیکس ادا کرنے کا پابند ہے۔

غالباً مقامی اداروں کے زوال اور وسائل کے ضیاع میں عدم دلچسپی نوآبادیاتی دور کی یادگار ہے۔ نوآبادیاتی دونوں میں دوسرا بیٹا اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ہندوستان آتا تھا۔ اس کے نزدیک بڑے مگر عمومی نوعیت کے مسائل زیادہ اہمیت رکھتے تھے جیسے افغان جنگیں یا ایسی اصلاحات جن سے مقامی لوگوں کو مہذب بنایا جا سکے۔ اس کے برعکس مقامی لوگوں کی فلاح و بہبود اس کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ نہ ہی اداروں کی تشکیل و تنظیم، اقتصادیات، پیداوار یا عمومی اہلیت و قابلیت سے اسے کوئی سروکار تھا۔ اسے اپنے قریبی لوگوں سے واسطہ تھا یا نائٹ ہڈ (Knight hood) کے حصول سے دلچسپی تھی۔

اب نوآبادیاتی عہد کب کا گزر گیا ہے پھر بھی اپنے آزاد ملک میں ہم ہر پل اور ہر لمحہ زوال اور افراتفری کو دیکھ رہے ہیں تب ہمیں نوآبادیاتی دور موجودہ زمانے سے مقابلتاً زیادہ پرامن دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں چاہئے تو یہ تھا کہ آزادی کے بعد اداروں کی تشکیل و تنظیم پر توجہ دیتے اور ان کی ترقی پر اپنی قوتیں صرف کرتے اور یہ نہ ہوتا کہ بیرونی ایجنسیوں کو ہمارے اداروں کے قیام اور تنظیم کا کام سونپا جاتا۔ دراصل اس کام کے انجام دینے میں پریس اور صحافیوں پر اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

پریس کو چاہئے کہ وہ اداروں سے متعلق اصلاحات کا کام کرنے کے بارے میں بات چیت کا آغاز کرے اوران اداروں کے باسوں (Bosses) پر زور دے کہ وہ کام زیادہ کریں اور اخراجات کم کریں مزید یہ کہ پریس کوان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے جو تحقیقی وتخلیقی کام پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اوراصراف سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ جب تک ان اداروں میں اس قسم کی فضا قائم نہیں ہوجاتی ان اداروں کی حالت زار میں بہتری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

پاکستان میں سرکاری شعبے کے تحت بڑی تعداد میں کارپوریشنیں، تعلیمی ادارے مثلاً یونیورسٹیاں اور تحقیقی مراکز وغیرہ اور دیگر حکومتی ادارے اور محکمے قائم ہیں۔لیکن میری نظروں سے آج تک ان کی پیداواری قابلیت اور اخراجات کے بارے میں کسی قسم کا تفصیلی تجزیہ نہیں گزرا۔اور اگر ادارے کا تمام تر بجٹ اس ادارے کا باس ہی تن تنہا ہڑپ کر جائے تب بھی پریس اس میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کرتا۔اسی طرح اگر کوئی عمارت تعمیر ہوتو بھی اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی پریس عوام کو بتانے کی زحمت گوارہ کرتا ہے کہ اس عمارت پر کتنی رقم خرچ ہوئی اور کتنے مخصوص لوگوں کی جیبوں میں چلی گئی اور نہ ہی اس غیر ضروری سامان وآلات کے بارے میں کوئی تذکرہ کبھی اخبارات میں شائع ہوا جو کہ نجانے کیوں خرید لیا جاتا ہے۔

ہم خرد برد کے واقعات سے متعلق کہانیاں تو ضرور سنتے ہیں لیکن ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ یہ واقعات بین ثبوتوں کے ساتھ اخبارات کی سرخیوں میں بیان ہوں۔اور اگر ان واقعات کا ذکر ہوتا بھی ہے تو اگلے دن وہ قصہ پارنیہ بن چکا ہوتا ہے۔ دراصل ان باسوں نے میڈیا کو خوش رکھنے کا گر سیکھ لیا ہے۔اسی طرح وہ ان کہانیوں کو زبان زدعام ہونے سے بھی روکنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اکثر اداروں نے اپنے اپنے میڈیا سیل قائم کئے ہوتے ہیں جب بھی یہ ادارے کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں یا دوسرے پروگرام تشکیل دیتے ہیں تو اخبارات تک ان کی رپورٹ پریس ریلیز کے ذریعے سے پہنچتی ہے۔ بدقسمتی سے صحافی حضرات بھی ان جھانسوں میں باآسانی آجاتے ہیں جن کا اصل مقصد باس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر ہوتا ہے اور یوں بھی ان پریس ریلیزوں سے اخبارات کے صفحات آسانی سے بھرے جاتے ہیں۔کئی دفعہ تو اخبارات کے اداریوں کو اس طرح سے تحریر کیا جاتا ہے، جس سے کسی ادارے کے باس کی شہرت میں اضافہ ہوسکے۔

کچھ ایسے صحافیوں کے لئے جنہیں ہمارے عمومی مسائل سے دلچسپی ہو میں نے ایسے سوالات کی ایک فہرست مرتب کی ہے جو سرکاری شعبے کے تحت قائم کارپوریشنوں، اداروں اور محکموں

کے سربراہوں سے بار بار پوچھے جانے چاہیں۔ یہ سوالات درج ذیل ہیں!

- آپ کے سالانہ اخراجات کیا ہیں؟
- کیا آپ کو کوئی منافع ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کتنا؟
- کیا آپ کسی سرکاری مالیاتی ادارے سے ادھار لیتے ہیں؟ اگر لیتے ہیں تو کس قدر؟ اور کن شرائط پر؟ اس ادھار کے عوض ایسی شرائط جو اس ادارے نے عائد کی ہیں یعنی (Service requirements) کیا آپ ان پر پورے اتر رہے ہیں؟

آپ کے بجٹ میں کتنی رقم ادارے کے سربراہ کی سہولتوں پر خرچ ہو جاتی ہے؟ اور کتنی رقم ادارے کے سینئر ارکان پر اور عمارت اور اس کے ساز و سامان پر کیا اخراجات ہوتے ہیں؟

- آپ کے بجٹ کا کتنا تناسب ان سرگرمیوں پر خرچ ہوتا ہے جن کے لئے یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے؟
- کیا آپ معاشرے کے اس طبقے کی نشاندہی کریں گے جس میں اپنی تخلیق کی مانگ ہے؟
- کیا آپ ملکی بجٹ میں اضافے کا باعث ہیں یا حکومت سے مالی امداد حاصل کرتے ہیں؟ اگر حکومت کو کما کر دیتے ہیں تو کتنا؟ اور اگر حکومت سے رقم وصول کرتے ہیں تو کتنی؟ اگر آپ ٹیکس دہندہ سے رعایت لیتے ہیں تو آپ اسے کس طرح صحیح ثابت کریں گے؟
- کیا اس ادارے کے ملازمین اس مخصوص شعبے میں مطلوبہ قابلیت رکھتے ہیں جن سے وہ متعلق ہیں؟ کیا اس ادارے سے باہر بھی ان کی قدر و قیمت ہے؟ کیا ان میں سے کوئی بھی کبھی نجی شعبہ سے وابستہ رہا ہے؟ اور ان افراد کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کو کیسے جانچا جا سکتا ہے؟
- کسی ایسے شخص کے لئے جو اہلیت اور تعلیم رکھتا ہو اور اس ادارے میں کام کرنے کا خواہش مند بھی ہو! اس کے لئے کیا شرائط ہیں؟ وہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ جگہ کس طرح حاصل کر سکتا ہے جو اس کے معیار کے مطابق ہو؟
- اس ادارے میں اوسط مدت ملازمت کتنی ہے یعنی ایک شخص اس ادارے میں زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ ملازمت کر سکتا ہے؟ (یاد رہے مدت ملازمت زیادہ لمبی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس سے اس ادارے میں کام کرنے والے جمود کا شکار ہو جاتے ہیں)۔
- کسی بھی نااہل شخص کو اس ادارے سے نکال باہر کرنے کا کیا طریقہ کار ہے؟ محنتی لوگوں کو

آپ کیا فوائد بہم پہنچاتے ہیں؟ کیا محنتی شخص کو جلدی ترقی ملتی ہے یا ترقی کا واحد معیار بالوں کا سفید ہونا ہے؟

- آپ اپنے ملازمین سے کس قدر آسانی سے مل سکتے ہیں؟ کیا آپ کے فیصلوں میں وہ بھی رائے دینے کے مجاز ہیں؟ اور اگر وہ اپنی آراء کا اظہار چاہتے ہوں تو وہ کن ذرائع سے ایسا کر سکتے ہیں؟

- ادارے کے سربراہ کے تقرر کے کیا قواعد ہیں؟ کیا آپ کلی اختیارات کے حامل ہیں یا آپ کسی کو جوابدہ بھی ہیں؟ وہ افراد جن کو آپ جوابدہ ہیں وہ کس قدر آزاد ہیں اور انہیں آپ کی تنظیم کے بارے میں کتنی معلومات ہیں؟ آپ کی مدت ملازمت کتنی ہے اور یہاں سے فراغت پانے کے بعد آپ کا مستقبل کیا ہوگا؟

ان سوالات سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار سے محقق اس مخصوص ادارے میں ہونے والے تخلیقی و تحقیقی عمل اور اس کے ساتھ ساتھ ضیاع کے بارے میں صحیح نظریہ قائم کر سکے گا۔ محقق کو اس تنظیم کے بارے میں کسی قسم کا نظریہ قائم کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ تنظیم اپنے مقاصد کے حصول کی کتنی اہلیت رکھتی ہے اور ان مقاصد کو پا لینے کے لئے وہ کتنی رقم خرچ کرے گی۔ ایسے فیصلے پر پہنچنے سے پہلے محقق کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ اس مخصوص ادارے کے انتظامی ڈھانچے پر بھی غور کرے۔ چنانچہ انتظامی ڈھانچے کو جانچنے کے لئے کوئی معروضی معیار ضرور بنانا پڑے گا جس سے انتظامیہ کی کارکردگی کے علاوہ ملازمین کی اہلیت کو پرکھا جا سکے۔ ایسا کرتے وقت یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہوگا کہ ادارے کے مقاصد کیا ہیں اور کیا ان مقاصد کے حصول کے لئے ادارے کے ملازمین مناسب تربیت سے مرصع ہیں یا نہیں؟

صحافیوں کو ان سوالات کے جوابات کی مسلسل تلاش جاری رکھنی چاہئے تاکہ ٹیکس دہندگان کو باخبر رکھا جا سکے۔ ہمیں سیاستدانوں، پارلیمانی رہنماؤں یا طبقہ اعلیٰ کے دانشوروں سے کوئی توقع نہیں کہ وہ یہ کام کر سکیں گے انہیں تو پیسوں کے فراڈ کرنے اور وسیع سے وسیع تر ہوتی ہوئی حکومت سے فوائد کرنے سے ہی فرصت نہیں۔ اور یوں بھی بدانتظامی اور نااہلی سے فائدے حاصل کرنے والے سرکاری وسائل کو برباد ہونے سے کیوں بچائیں؟

بدقسمتی سے حکومت کے تمام تر وسائل چند مراعات یافتہ لوگوں کے لئے مخصوص ہیں اور اس ضیاع اور بیجا اخراجات کا بوجھ عوام کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ یاد رکھنے کے قابل نقطہ یہ ہے حکومت

اگر کوئی پیسہ بچاتی ہے تو یہ بچت دراصل ٹیکس دہندہ کے لئے ہوتی ہے۔مشرق وسطی میں امریکی پالیسی یا ہمیں مسلم دنیا کی رہنمائی کیسے کرنی چاہئے یا نیو ورلڈ آرڈر کا پھیلاؤ اور اس کے اثرات وغیرہ ذہنی عیاشی کا سامان تو ضرور مہیا کرتے ہیں لیکن کھانا مہیا کرنے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ایسے ملک میں جہاں غربت کا دور دورہ ہو اور وہاں کی اکثریت اس قبیح لعنت سے دوچار ہو اس کے بارے میں بے مقصد تجزیوں یا غیر ضروری بیانات داغنا بہت افسوسناک ہے! شاید ایسے ایماندار اور مخلص صحافی اب بھی موجود ہوں جو بے یار و مددگار غریبوں کی فکر کریں اور ایسے مسائل جن کا ہم اوپر تذکرہ کر آئے ہیں اس ملک کے مستقبل کے لئے ان کے بارے میں تحقیق و تفتیش کریں!

(15)

چند تارکین وطن پاکستانیوں سے گفتگو!

یہ انٹرویو امریکہ میں مقیم کچھ تارکین وطن پاکستانیوں کی آراء کا اظہار ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ان کے خیالات کو پوری دیانتداری کے ساتھ آپ تک پہنچا پانے میں کامیاب ہوا ہوں گا۔ لیکن شاید یہ کہنا بیجا ہوگا کہ خیالات جو یہاں پیش کئے گئے ہیں تمام تارکین وطن کی ترجمانی نہیں کرتے۔

س: خواتین وحضرات! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ پاکستان سے بہت دور چلے آئے ہیں اس لئے آپ کو اب اس سے دلچسپی نہیں رہی؟

ج: اس کے بالکل برعکس "فاصلے کی وجہ سے ملک کے لئے محبت مزید بڑھ جاتی ہے" بیرون ملک بسنے والے لوگوں میں یہ کہاوت بڑی عام اور مقبول ہے۔ غالباً ان سے زیادہ بہتر انداز میں اس کہاوت کو اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ہم لوگوں کا بیشتر وقت ان مسائل پر بحث کرتے ہوئے یا ان پر غور کرتے ہوئے گزرتا ہے۔ ہمارا سامنا چونکہ نئے خیالات، نظریات ایک مختلف کلچر اور کام کرنے کے جداگانہ طور طریقے سے ہوتا ہے اس لئے یہ ہماری خواہش ہے کہ علم کی ہمیں میسر آنے والی یہ دولت کسی طرح اپنے ملک پہنچا سکیں تاکہ وہاں کے حالات میں بہتری آسکے اور ہماری وطن واپسی کے لئے بھی راستہ ہموار ہو سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ ملک میں ترقی کا فقدان اور اقتصادی پس ماندگی ہی ہمارے تارک وطن ہونے کی بنیادی وجہ ہے۔

س: کیا آپ ملک کے عوام، پالیسی سازوں اور افسروں تک اپنے خیالات اور نظریات پہنچانے کے قابل ہو سکے ہیں؟

ج: "دوری کچھ حد تک پس منظر کو جنم دیتی ہے" یہ ایک کہاوت ہے جسے ہمیں اپنی کہاوتوں کی فہرست میں شامل کر لینا چاہئے۔ بہت اکثر تارکین وطن ہماری طرح محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ہم وطن جو پاکستان ہی میں رہائش پذیر ہیں ہمارے خیالات کو ناقابل عمل اور عجیب وغریب سمجھ کر پس

پشت ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے علم اندر کے لئے موجزن جستجو، چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کا جذبہ اور ہماری مال و دولت، اس کی وجہ سے ہمیں قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم واپس آ جائیں اور بیرون ملک میں رہ کر ہم نے جو کچھ سیکھا ہے اسے یکسر بھلا دیں تب کہیں جا کر ہم معاشرے کے لئے مثبت کردار ادا کرنے کے قابل ہو پائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ باقی دنیا سے ہم نے جو کچھ سیکھا ہے اور ہمیں معروضی انداز میں اپنے مسائل پر غور کرنے کا جو موقع میسر آیا ہے ان کی ہمارے پاکستانی بھائی قدر نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم پاکستان میں موجود اپنے ذاتی مفادات اور اغراض کو ترجیح دینے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی کسی تارک الوطن نے بینک سے قرضے لے رکھے ہیں نہ ہی انہیں اس طرح کی سہولت حاصل ہے۔ (اگر چہ ہم میں بھی کئی ایسے ہونگے جو پاکستان میں موجود پیسوں کا فراڈ کرنے والوں کے ایجنٹ ہونگے لیکن عام طور پر صورتحال ایسی ہرگز نہیں)۔ نہ ہی ہم میں سے کسی نے حکومت سے لائسنس حاصل کئے ہیں۔ بلکہ ہماری مخلصانہ اور دل کی گہرائیوں سے یہ خواہش ہے کہ پاکستان میں ادارے ترقی کریں وہاں کی معیشت مضبوط بنیادوں پر استوار ہو جائے اور ہم امن وسکون کے ساتھ اپنے وطن آ کر رہ سکیں۔

ہم میں اکثریت ایماندار اور محنتی پاکستانیوں کی ہے جنہوں نے اپنے بچپن کی سرزمین کو خیر باد اس لئے نہیں کہا کہ انہیں اس سے محبت نہیں یا وہ اس سے برگشتہ ہو گئے ہیں بلکہ ہم نے اس سرزمین کو معاشی وجوہات کے پیش نظر خیر باد کہا اور ہم یہ امید کرتے ہیں کہ ایک دن ہم اس قدر پیسہ بچالیں گے کہ واپس جا کر آرام واطمینان سے رہ سکیں لیکن ہم اس حقیقت سے بھی پوری طرح سے باخبر ہیں کہ ہمارے اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں پاکستان میں استحکام اور معاشی ترقی کو یقینی بنانا ہوگا اس طرح یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے سے زیادہ سچا محبّ وطن کوئی نہیں کیونکہ قوم کی بھلائی کے علاوہ اور کوئی ذاتی مفاد ایسا نہیں کہ جسے ہم قومی مفاد پر مقدم سمجھیں۔

اس کے باوجود ہمارے خیالات اور تجاویز کو نامناسب اور ناقابل عمل سمجھ کر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ محض اس لئے کہ ان سے اپنے مفادات کو عزیز رکھنے والا طبقہ خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح ہمیں میڈیا کی طرف سے بھی کوئی پذیرائی نہیں ملتی۔ پاکستان کی تمام اہم شخصیات خواہ وہ سیاستدان ہوں، فوج کے اعلیٰ افسران ہوں، سفارتکار ہوں یا بیوروکریٹس ہوں ہمیں قابل نفرین سمجھتے ہیں اور وہی سلوک ہمارے ساتھ بھی روا رکھتے ہیں جو وہ پاکستانی عوام کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ عزت سے پیش آئیں تو وہ یہی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہم روایتی چاپلوسی کا مظاہرہ کر رہے

ہیں حالانکہ ہم ان کے ساتھ یہ برتاؤ اس لئے کرتے ہیں کیونکہ ہمیں پاکستان سے محبت ہے اور یہ حضرات پاکستان سے آئے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو اگر کوئی چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی ہے تو وہ ہمارے خیالات اور تجاویز ہیں کیونکہ انہیں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ ان تجاویز کو حقیقت کا روپ دے دیا جائے تو ان کی طاقت اور اختیارات میں نمایاں کمی واقع ہو جائے گی۔

س: کیا آپ لوگوں کو وطن سے کافی اطلاعات (خبریں) موصول ہوتی ہیں؟

ج: دوری کی وجہ سے جو پسندیدگی اپنے ملک کے لئے ہمارے دلوں میں ابھر آتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم پاکستان سے آئے ہوئے اخبارات اور میگزین رغبت سے پڑھتے ہیں۔ ہمیں اس قدر اعلیٰ پائے کے اخبارات و جرائد مہیا کرنے پر ہم صحافی برادری کے مشکور ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں پاکستان کی صحافت میں قابل قدر ترقی دیکھنے میں آئی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ مزید ترقی کے امکانات بہت روشن ہیں۔ اس ترقی پر ہم صحافی بھائیوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ واقعی یہ از حد اطمینان کی بات ہے کہ صحافت کا معیار معقول حد تک بہتر ہو گیا ہے یہ اطمینان دوچند ہو جاتا ہے جب صحافتی اداروں کے محدود وسائل کو پیش نظر رکھا جائے۔ جنہیں ایماندار، محنتی اور اپنے کام سے محبت رکھنے والے افراد چلاتے ہیں۔

لیکن انگریزی اخبارات اور جرائد کے بارے میں ایک حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ ان مسائل کو خاطر میں نہیں لاتے جن کا پورے معاشرے کو سامنا ہوتا ہے بلکہ یہ محض مغربی نظریات اور طرز زندگی رکھنے والے مخصوص طبقے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

س: کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ان اخبارات کو ایک عام (متوسط درجے کے) پاکستانی سے بہت کم دلچسپی ہے؟۔ (اپنے دلائل کو ثابت کرنے کے لئے ان لوگوں نے مختلف اخبارات و جرائد مثلاً ہیرلڈ، دی فرائیڈے ٹائمز، نیوز لائن، دی ڈان اور دی نیشن کے شمارے پیش کئے۔)

ج: اس سوال کا جواب دینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ بیشتر اخبارات اور جرائد کا مشاہدہ کیا جائے کہ وہ زیادہ تر کونسی چیزیں شائع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہمارے اخبارات میں زیادہ تر جگہ یا تو حکومت کی طرف سے جاری کی جانے والی پریس ریلیز سے پر کی جاتی ہے یا واجبی سی تعلیم رکھنے والے اپنی ہی نوعیت کے جاگیردار جو سیاستدان بن گئے ہیں ان کے احمقانہ بیانوں سے۔ جن کی شہرت کی واحد وجہ یہ ہے کہ ان کے بڑے بزرگوں نے وفاداری کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے انگریز آقاؤں کی خدمت کی۔ مثال کے طور پر یہ دیکھ کر طبیعت متلانے لگتی ہے کہ اخبار کی شہ سرخی میں بی بی

نے آئی جے آئی کے مولویوں کو رجعت پسند کہا ہے اور اس شہ سرخی کے نیچے دی گئی تفصیل میں بھی یہی کچھ ہی رقم ہوتا ہے۔ یا اسی طرح بی بی کے خاوند پر دوسرے فریق نے کرپشن کا الزام لگایا ہوتا ہے جس کا اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا اور اخبار میں یہ خبر نمایاں طور پر جلی حروف میں چھپی ہوتی ہے۔ غالباً اب وقت آن پہنچا ہے کہ ان حماقتوں کے لئے اخبار کے آخری صفحے کا سب سے نچلا کونا مخصوص کر دیا جائے۔ تاکہ ان سیاستدانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اخبار کا صفحہ اول ان کی جائیداد نہیں اور نہ ہی اس پر ان کے بیانات اور تصاویر کا چھاپا جانا ان کا پیدائشی حق ہے۔ صفحہ اول پر ان سے متعلق خبریں اور ان کے بیانات اس وقت تک نہیں چھاپے جانے چاہیں جب تک وہ کوئی کام کی بات نہ کریں۔ کیونکہ ان کی حماقتوں سے محظوظ ہونے کے لئے ہمارے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔

ہمارے دانشوروں اور میڈیا کے سرکردہ حضرات کیلئے بڑے اور عمومی نوعیت کے مسائل زیادہ کشش رکھتے ہیں۔ یہ خاصیت زیادہ واضح انداز میں پرانی سول سروس سے متعلقہ افسروں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور یہ انگریز کے قائم کردہ تعلیمی نظام کی وجہ سے ہماری صحافیانہ روایات میں بھی در آئی ہے۔ ہمارے ہاں طبقہ امراء سے تعلق رکھنے والے پڑھے لکھے لوگوں کا میلان بھی پرانے وکٹورین افراد کی طرح کا ہے کہ وہ کلاسیکی علوم وفنون سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں اور کسی مخصوص فن یا ہنر میں مہارت پیدا کرنے یا تکنیکی علم حاصل کرنے سے کتراتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمومی نوعیت کے بڑے مسائل مثلاً امور خارجہ وغیرہ عمومی سیاست یا چیدہ چیدہ آئینی مسائل پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے چنانچہ ہماری خارجہ پالیسی کیسی ہونی چاہئے یا آئینی مسائل کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر کیا ہونا چاہئے۔ اس طرح کے معاملات سے متعلق آپ کو لاتعداد تجزیے میسر آ جائیں گے۔ اخبارات میں بدقسمتی سے انہی چیزوں کو ترجیحی بنیادوں پر چھاپا جاتا ہے اور مقامی مسائل کے لئے اخباروں اور جریدوں میں بہت کم جگہ مختص ہوتی ہے۔

س: مقامی مسائل! مثلاً؟

ج: جیسے تعلیم کی مثال لے لیجئے! ہماری زیادہ آبادی ناخواندہ ہے۔ اسی طرح آبادی میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمارے ہاں نوجوانوں کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے۔ بغیر مناسب تعلیم کے ہم غیر تربیت یافتہ مزدوروں کا حجم غفیر پیدا کر رہے ہیں جو کہ بین الاقوامی سطح پر مقابلہ کرنے کے قطعی اہل نہیں ہو سکتے جہاں مقابلہ بہت کڑا ہوتا ہے۔ اگر متوسط درجے کے پاکستان شہری کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تعلیم کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے لئے

مناسب پالیسی اور میڈیا کی خاص توجہ کی اشد ضرورت ہے۔

لیکن طبقہ امراء کے لئے جو اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے باہر کے اداروں میں بھیجتے ہیں یہ مسئلہ بالکل اہم نہیں۔ان کے نزدیک یہاں کے غیر معیاری سکول اور یونیورسٹیاں مقامی لوگوں کے لئے بہت کافی ہیں۔میڈیا کا نقطہ نظر بھی کم وبیش یہی ہے اعلیٰ معیار کے اخبارات وجرائد میں تعلیم کے بارے میں ایک بھی مضمون نہیں چھپتا اور نہ ہی سالہا سال پرانے طرز تعلیم وتدریس کی تبدیلی کے لئے وہ آواز بلند کرتے ہیں۔ جہاں تک یونیورسٹیوں اور تحقیقی مراکز کا تعلق ہے تو انہیں بالکل ذاتی جاگیروں کی طرز پر چلایا جاتا ہے۔ان کے منتظمین ایسے افراد ہوتے ہیں جن کا علمی میلان سرے سے ہوتا ہی نہیں اس کے باوجود میڈیا اس طرف توجہ نہیں دے رہا۔اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ میڈیا اس سے بھی صرف نظر کئے ہوئے ہے کہ یہ تعلیمی مراکز مختص شدہ فنڈز کو کیسے استعمال میں لاتے ہیں اور اخراجات میں ان کی ترجیحات کیا ہیں حتیٰ کہ امتحانات لینے میں بلاوجہ تاخیر اور یونیورسٹی میں انتظامی سہولت کی خاطر چھٹیاں کر دینا جیسے مسائل بھی میڈیا کی دلچسپی حاصل نہیں کر سکے۔

فیشن اور آرٹ کو تو ان جرائد میں بھرپور پذیرائی ملتی ہے لیکن تعلیم کو نہیں! مذکورہ بالا جرائد میں فیشن اور آرٹ کا تو مخصوص شعبہ ہوتا ہے مگر تعلیم کیلئے ایسی سہولت فراہم نہیں کی گئی۔آخر کار فیشن سے مرصع لباس طبقہ امراء کے افراد زیب تن کرتے ہیں اور آرٹ ان کے لیونگ رومز کی شان بڑھاتے ہیں اور پاکستان میں دی جانے والی تعلیم کا اس طبقے سے کوئی تعلق نہیں!

(ب) سماجی اور سیاسی مضامین

(16)

کیا تمام تارکین وطن نے پاکستان کو خیرآباد کہہ دیا؟

پاکستانی تارکین وطن سے بڑے ہی تمسخرآمیز انداز میں یہ سوال بہت اکثر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہمارے پاکستانی بھائی ہمیں یہ تاثر دیتے ہیں کہ جیسے ہم نے انہیں مورچوں میں لڑنے کے لئے تن تنہا چھوڑ دیا ہے۔ اور ڈالر کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو فروخت کر دیا ہے جبکہ پاکستان میں مقیم تمام لوگ معمولی آمدنی پر صرف اس لئے گزر بسر کر رہے ہیں کیونکہ انہیں پاکستان سے محبت ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے خیالات کو ترویج دینے والے امیرانہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں کم از کم ہمارے معیار کے مقابلے میں تو ان کے رہن سہن کا انداز بہت معقول ہوتا ہے۔ (یہ لوگ اکثر اوقات فرسٹ کلاس (ہوائی جہاز کی) میں سفر کرتے ہیں اور روز افزوں اخراجات سے قطعاً نہیں گھبراتے۔ کم از کم ہم ایسا نہیں کر سکتے)۔ بہرحال یہ بالکل دوسرا موضوع ہے جس پر کسی اور وقت اور جگہ اظہار خیال کیا جائے گا۔

اس الجھن کو سلجھانے کیلئے میں نے حال ہی میں امریکہ میں مقیم بڑی تعداد میں معروف ڈاکٹروں، پیشہ ور ماہروں (Professionals) اور ماہرین تعلیم و نصاب سے یہی سوال کیا۔ ان کے ساتھ اس موضوع پر بات چیت کے دوران کافی دلچسپ کہانیاں سننے کو ملیں جنہیں میں پاکستانی قارئین کے گوش گزار کرنا پسند کروں گا۔ خاص طور پر میں تین قصے سنانا ضروری سمجھتا ہوں جن سے بیرون ملک مقیم ان پاکستانی پیشہ ور ماہرین کی حالت زار کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے اعلیٰ ترین تربیت حاصل کی اور پاکستان واپس جا کر ملکی بہتری کیلئے کام کرنے کا خواب دیکھا۔ بدقسمتی سے ان کی ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ اپنی شناخت واضح نہیں کرنا چاہتے۔

ایک مشہور سرجن جو ایک خاص قسم کی سرجری کرنے میں مہارت رکھتے ہیں انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پاکستان میں کئی ہسپتالوں اور اپنے ڈاکٹر دوستوں سے رابطہ کیا تاکہ وہ اپنی مہارت سے انہیں مستفید کر سکیں لیکن کسی نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہ کیا جس سے ڈاکٹر موصوف کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ انہوں نے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ اپنے خرچ پر پاکستان آنے کو تیار ہیں

تا کہ وہ مخصوص سرجری جس میں انہیں مہارت حاصل ہے اسے پاکستان میں متعارف کروایا جا سکے اور اس کے علاوہ نوجوان ڈاکٹروں کو بھی اس کی تربیت دی جا سکے۔ انہوں نے ہسپتالوں کو صرف ضروری آلات آپریشن تھیٹر اور مریضوں کے فراہمی نیز تربیت حاصل کرنے کے خواہش مند ڈاکٹروں کے بارے میں کہا تھا۔ ان ڈاکٹر صاحب کا ارادہ تھا کہ ان تمام اشیاء کے مہیا ہو جانے پر وہ بغیر کسی معاوضہ کے اتنے ہی آپریشن روزانہ کریں گے جتنے وہ امریکہ میں کرتے ہیں۔ اس پیشکش کے باوجود ڈاکٹر صاحب کو کوئی مثبت جواب نہ ملا۔

ایک اور معروف میڈیکل سپیشلسٹ نے مجھے بتایا کہ وہ بہت سا پیسہ خرچ کر کے اور اپنی کامیاب میڈیکل پریکٹس کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ حالانکہ انہیں امریکہ میں بہت اچھی نوکریوں کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے پاکستان میں اسسٹنٹ پروفیسر کی نوکری کو قبول کیا اور یہاں چلے آئے اس کے بعد دو سال سوائے مایوسی کے انہیں کچھ نہ ملا۔ ہسپتالوں میں سینئر جونیئر کی غیر ضروری تمیز نے وہاں کا ماحول مکدر کر رکھا تھا۔ سینئر ڈاکٹر جو بہت پہلے ڈاکٹری کے تمام رموز بھول بھلا چکے تھے اب انہوں نے سازشوں اور سیاست بازی میں مہارت حاصل کر لی تھی علاوہ ازیں وہ ہسپتال کے تمام وسائل کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ ان سینئر ڈاکٹروں کے مریضوں کی دیکھ بھال کرنا جونیئر ڈاکٹروں کے فرائض میں شامل تھا اس کے علاوہ جونیئر ڈاکٹروں کو اپنے سینئر حضرات کی خامیوں۔ نالائیوں اور غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی بھی ترغیب دی جاتی تھی۔ اپنے سٹیٹس کو برقرار رکھنے کیلئے ہر جائز و ناجائز ذرائع کو اپنایا جاتا تھا اور میرٹ تو محض موم کی ناک بن کر رہ گئی تھی۔ ان ڈاکٹر صاحب کو یہ تک کہا گیا کہ وہ اپنے سے سینئر ڈاکٹر سے بڑی کار نہیں رکھ سکتے۔ مزید برآں ان سے یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ طبقہ امراء کے ہاں عاجزانہ حاضری بھی دیا کریں جن میں بیوروکریٹس، سیاستدان اور جاگیردار شامل تھے۔ آخر کار اس مایوس کن صورتحال سے تنگ آ کر اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ ہمارے معاشرے کے ان تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے قاصر ہیں انہوں نے ڈاکٹر رہنا ہی بہتر سمجھا اور واپس امریکہ سدھار آئے۔

تین پروفیسروں نے جن کا تعلق بالترتیب الیکٹرونکس، اکنامکس اور ریاضی کے شعبوں سے تھا مجھے بتایا کہ انہوں نے کئی دفعہ سنجیدگی سے پاکستان واپس جانے کے بارے میں سوچا لیکن کافی سوچنے سمجھنے کے بعد انہیں یہ ممکن نظر نہ آیا۔ دراصل ان تینوں حضرات کو پاکستانی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں کام کرنے کا تجربہ تھا اور یہ تینوں کئی مرتبہ مختصر دورانیے کے پیشہ وارانہ دوروں پر پاکستان

گئے بھی تھے۔ان میں سے ایک نے تو کافی عرصہ پاکستان کے مشہور ترین تحقیقی ادارے میں کام بھی کیا لیکن ان صاحب کو وہاں سے برخواست کر دیا گیا۔(یہ ایک اور دلچسپ کہانی ہے)۔

ان پروفیسروں کا کہنا تھا کہ اس ملک میں اتنی بڑی تعداد میں یونیورسٹیاں اور تحقیقی مراکز قائم ہیں جن کے لئے بجٹ میں بھاری رقوم مختص کی جاتی ہیں اور ان اداروں کے اخراجات بھی بے پناہ ہیں لیکن ان میں سے کوئی ادارہ معیاری ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی بھی سنجیدہ ماہر علم اگر پاکستان لوٹے تو اسے سنجیدہ علمی فضا میسر آ ہی نہیں سکتی۔اور یہاں آنے کے بعد اسے جلد ہی یہ احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ اس کی تخلیقی صلاحیت زنگ آلود ہوتی جا رہی ہے۔اور جب وہ بیرون ملک لوٹ جاتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معیار اور کام کرنے کی صلاحیت میں کمی واقع ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ سوچنا بیوقوفی ہوگی کہ وہ واپس جا کر تعلیمی و تدریسی اداروں کی علمی فضاء کو بہتر بنا سکیں گے ایسا بالکل ناممکن ہے۔ یہ تمام ادارے حقیقتاً جاگیرداروں کے زیر کنٹرول ہیں جو کسی بھی نئے خیال یا نظریئے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ان جاگیرداروں کا جنہیں یونیورسٹیاں اور تحقیقی مراکز جاگیروں کے طور پر عطا کر دیئے جاتے ہیں کبھی بھی علم و تحقیق سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوتا اور اگر کسی زمانے میں کوئی تعلق واسطہ ہوتا بھی ہے تو وہ بھول بھلا چکے ہوتے ہیں اب ان کا واحد مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح اپنی ان جاگیروں کی حفاظت کر سکیں اور وہاں پر موجود ان کے مزارعین (ادارے کے ملازمین) کو اپنی تابعداری میں رکھ سکیں۔اور اگر کوئی احمق نئے خیالات یا تھیوری کے ساتھ ان اداروں میں آن ٹپکتا ہے تو اسے بہت جلد بتا دیا جاتا ہے کہ اس کو کیسے برتاؤ کا مظاہرہ کرنا ہے بالکل اسی طرح جیسے ٹیلی ویژن کی سیریل ''روٹس'' میں ''کنتا کتے'' کو مار مار کر راہ راست پر لایا جاتا ہے۔

ان قصوں کو بیان کر دینے کے بعد نتائج میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

(17)

شعبہ میڈیکل میں بداعمالیاں

ڈاکٹروں کے مریضوں سے بہیمانہ برتاؤ اور غفلت کے دل دہلا دینے والے قصے ہم سب نے سن رکھے ہیں۔ ان تمام قصے کہانیوں کے باوجود ایسا کوئی ضابطہ اخلاق وجود نہیں رکھتا جو کہ ڈاکٹروں پر نافذ کیا جا سکے۔ اگرچہ باقی تمام مہذب ممالک کی طرح پاکستان میں بھی پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن (پی ایم اے) کے نام سے ایک تنظیم قائم ہے جس کے ذمے میڈیکل کے شعبے کی نگرانی (Self Policing) کرنا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس تنظیم نے اپنے بنیادی مقصد کی تکمیل کے لئے زیادہ فرض شناسی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس نے نہ ہی موثر انداز میں نگرانی کا کام کیا ہے تاکہ اس شعبے میں ہونے والی کوتاہیوں اور غفلتوں کا بالکل خاتمہ کیا جا سکے۔ اس کے برعکس پی ایم اے نے صرف ڈاکٹروں کی صفوں میں اتحاد پر ہی اپنی توجہ مرکوز کئے رکھی ہے علاوہ ازیں یہ تنظیم اسی کوشش میں مصروف رہی ہے کہ پورے میڈیکل کے شعبے پر اس کی اجارہ داری قائم رہے۔

کوئی بھی ڈاکٹر کسی دوسرے ڈاکٹر کے خلاف گواہی دینے یا ثبوت فراہم کرنے پر تیار نہیں ہوتا بے شک اس کی غفلت کتنی ہی واضح اور سنگین نوعیت کی کیوں نہ ہو۔ دراصل ہماری پوری تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی بھی ڈاکٹر نے کسی دوسرے ڈاکٹر کی بداعمالی کے خلاف کھلے عام گواہی دی ہو۔ نہ ہی پی ایم اے نے میڈیکل کے شعبے میں کی جانے والی بداعمالیوں اور غفلتوں کا کبھی نوٹس لیا ہے۔ کیا اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں پورے شعبہ میڈیکل میں ہمیشہ سے سب کچھ بالکل ٹھیک ہے؟

اس تاثر کے باوجود کہ جو شعبہ میڈیکل سے متعلق حضرات دینے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح کی کہانیاں ہر طرف سے سننے کو ملتی ہیں کہ ہسپتالوں میں مریضوں کی چارپائیاں درختوں تلے پڑی ہوتی ہیں یا انہیں مجبوراً ہسپتال کے چائے خانوں میں رہنا پڑتا ہے کیونکہ عموماً وہاں مریضوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ایسے بچے کے متعلق بھی سننے کو ملتا ہے جسے بوقت پیدائش فرش پر گرا دیا گیا اور وہ زندگی بھر کے لئے جسمانی یا ذہنی معذوری کا شکار ہو گیا یا ایسے مریض کے متعلق

بھی عموماً تذکرہ ہوتا ہے جسے دل کا عارضہ تھا لیکن ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق وہ دمہ تھا چنانچہ اس کا دمے کا علاج شروع ہوگیا جو اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا' اسی طرح ایسی بھی مثال ملتی ہے کہ مریض کو فشارِ خون (Low Blood Pressure) کی شکایت تھی لیکن تشخیص میں تاخیر کے باعث اس کا ہارٹ فیل ہوگیا یا مریض جس کی حالت اس قدر خراب تھی کہ اسے ڈاکٹر کے لایا نہ جاسکتا تھا اس لئے انتقال کر گیا کیونکہ ڈاکٹر نے اس کے پاس جا کر اسے بروقت طبی امداد دینے سے انکار کر دیا تھا۔ زیادہ دوائیاں دے دینا یا ان دوائیوں کو تجویز کرنا جن کے استعمال پر پابندی ہو یا سپیشلسٹ کی اس کی ''سیاسی مصروفیات'' کے باعث جدید ترین طریق علاج سے عدم واقفیت وغیرہ! اس نوعیت کے قصے کہانیاں تو زبان زدِ عام ہیں۔ اسی طرح بعض بڑے ڈرامائی واقعات بھی وقوع پذیر ہوئے مثلاً ایک ڈاکٹر نے حادثے سے بری طرح زخمی ہونے والے مریض کا آپریشن کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسے کسی پارٹی میں جانا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ زخمی ہونے والا اس کا اپنا بیٹا تھا۔

یہ ضروری نہیں کہ ایسی کہانیاں سچائی پر مبنی ہیں یا نہیں (میرے ذاتی خیال میں ان میں سے اکثر کہانیوں کی تصدیق کی جاسکتی ہے)۔ دراصل اہمیت اس بات کی ہے کہ ایسی کہانیوں کا اتنے بڑے پیمانے پر گردش میں رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ لوگ ڈاکٹروں اور پی ایم اے کے دلائل (جو وہ اپنے برتاؤ کے دفاع میں دیتے ہیں) سے اتفاق نہیں کرتے اور اس بات کا انہیں یقین ہے کہ شعبہ میڈیکل میں بداعمالیاں پائی جاتی ہیں بلکہ وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہیں۔ بالکل یہی خیال طبقہ امراء کا بھی ہے جن میں امیر ڈاکٹر۔ بیوروکریٹ۔ جرنیل' سیاستدان اور امیر لوگ شامل ہیں۔ وہ بھی پاکستان میں میڈیکل کے نظام پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں اسی لئے اگر انہیں چھینک بھی آجائے تو طبی معائنہ کرانے بیرون ملک دوڑتے ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات حکومتی خرچ پر بیرون ملک جاتے ہیں۔

حال ہی میں ہم میں سے کچھ لوگوں کو پاکستان سے تعلق رکھنے والے بہت ہی قابل اور انوکھی صلاحیت کے حامل ڈاکٹر کے خیالات کو جاننے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر اختر کو صحت عامہ (Public Health) کے شعبے میں نمایاں خدمات سرانجام دینے کی وجہ سے واشنگٹن کا ہیلتھ کمشنر مقرر کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو صحت عامہ میں بہتری لانے کے لئے وقف کیا ہوا ہے اور وہ 4 برس تک پاکستان میں کمیونٹی میڈیسن کے کالج کے پرنسپل رہے ہیں ڈاکٹر اختر اور ان کی بیگم جو کہ گائنی کالوجسٹ ہیں ان دونوں نے پاکستان میں صحت عامہ کے مسائل کا مطالعہ کرنے میں کافی وقت

صرف کیا ہے بلکہ انہوں نے ملک کے دوردراز کے علاقوں میں دوائیاں پہنچانے میں بھی بڑی جانفشانی کا مظاہرہ کیا۔

ڈاکٹر اختر کا خیال ہے کہ پاکستان میں میڈیسن کے شعبے میں بہت گھمبیر بداعمالیاں پائی جاتی ہیں۔مثال کے طور پر انہوں نے اپنا ایک مشاہدہ بیان کیا جس کے ذریعے انہیں معلوم ہوا کہ اکثر مریض جب ہسپتالوں میں داخل کئے جاتے ہیں تو ان کا معمول کا بلڈ ٹیسٹ نہیں کیا جاتا اور جن مریضوں کا فوری طور پر آپریشن کرنا ضروری ہوتا ہے انہیں بھی کئی کئی دن تک اس بنا پر انتظار کرنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبان دوسری مصروفیات میں الجھے ہوتے ہیں یہاں میڈیسن سے متعلق مسائل اس وجہ سے بھی لاینحل لگتے ہیں کیونکہ سپشلسٹ ڈاکٹروں کی تعداد بہت کم ہے ان کے پاس نہ تو اپنے مریضوں کے لئے وقت ہوتا ہے اور نہ اپنے پیشے سے متعلق ہونے والی نئی تحقیق سے آگاہی!

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پی ایم اے کا دوسرے ممالک کی میڈیکل کے شعبے سے متعلق پیشہ وارانہ تنظیموں سے تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں صحت کے مسائل کے بارے میں جاننے' معلومات فراہم کرنے یا کسی قسم کی پالیسی مرتب کرنے کے لئے یہ تنظیم اپنے ذرائع کام میں نہیں لاتی۔ پی ایم اے صحت سے متعلق مسائل پر خاموشی اختیار کئے رہتی ہے حالانکہ اسے خاص طور پر غریبوں اور تعلیم سے محروم طبقات کی صحت پر توجہ دینی چاہئے اور اس سے متعلق کوئی واضح پالیسی مرتب کرنی چاہئے۔ غالباً وہ کام جو یہ بڑی رغبت اور لگن سے کرتی ہے وہ اپنے عہدیداروں کی ترقی اور فلاح و بہبود تک ہی محدود ہوتا ہے۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بہت ہی سیاسی قسم کی تنظیم ہے جو ڈاکٹروں کی بداعمالیوں پر نظر رکھنے کی بجائے اپنے مفادات پر نظر رکھتی ہے۔

بدقسمتی سے ان کہانیوں کے علاوہ جو ہر گھر میں سنی سنائی جاتی ہیں اس قدر اہم مسئلے پر کوئی حقیقی ثبوت اکٹھے نہیں کئے جا سکے۔ بے شک ہمارے طبقہ اعلیٰ کے دانشور اس قسم کے ادنیٰ مسائل پر وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے انہیں تو خراب سے خراب تر ہوتا ہوا ماحول' شراکت (Participation) غربت اور حکومت کے دیگر مسائل پر غور و فکر کرنے سے فرصت نہیں ملتی اور نہ ہی رقم فراہم کرنے والی ایجنسیوں کو ان سے کوئی دلچسپی ہے۔ان مسائل پر بہت ہی سادگی لیکن محنت سے کام کرنے کی ضرورت ہے اس کے لئے بداعمالیوں کی کہانیوں کو اکٹھا کرنا ہوگا اور ان کی تصدیق کرنی ہوگی۔اس طرح کی کوشش کے ضمن میں زبان زدعام کہانیوں کے لئے اخبار میں ایک اشتہار دینا ہوگا اور جب یہ کہانیاں جمع ہو جائیں گی تو ان کی تصدیق کے لئے تگ و دو کی ضرورت پڑے گی۔

تب انہیں چھپوا دیا جائے گا۔

شاید یہ خوف کہ انہیں کوئی دیکھ رہا ہے یا نگرانی کر رہا ہے ڈاکٹروں کو زیادہ محتاط اور چست بنا دے اور ہوسکتا ہے کہ ہمارے دانشوروں کو کانفرنسوں کے سرکٹ سے کچھ عرصہ کے لئے دور رہنا پڑے کیونکہ حقائق کو اکٹھا کرنا محنت طلب کام ہوتا ہے اور کانفرنسوں میں شریک ہونے سے ایسا کام انجام تک نہیں پہنچ سکتا۔ بہر حال اس کے ذریعے ہمیں قصوں کہانیوں کی بجائے جانچے ہوئے اعداد و شمار میسر آ جائیں گے۔

(18)

وقار، عزت، غیرت اور منافقت

پاکستان میں ہم وقار، غیرت اور عزت جیسے تصورات کو بہت عزیز جانتے ہیں۔ بہادری، غیرت، ایمانداری، فرض شناسی، پرہیزگاری اور انسانیت سے محبت جیسے قبائلی اور جاگیرداری ثقافت سے متعلق تصورات سے ہمارا ادب شاعری اور لوک کہانیاں بھری پڑی ہیں۔ ہماری فلمیں بھی انہیں تصورات کو نہایت ڈرامائی انداز میں پیش کرتی ہیں اور بچوں کی درسی کتب میں تو ان قدروں کا اظہار اس قدر والہانہ انداز میں کیا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو متلی ہونے لگتی ہے اگر ان درسی کتب میں پیش کی جانے والی ان اقدار سے بھری کہانیوں پر یقین کر لیا جائے تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے معاشرے میں کوئی برائی سرے سے ہے ہی نہیں، اور ہم ایسے مجاہدین ہیں جو مسلسل جہاد میں مصروف ہیں۔

کوئی غیر ملکی جو ہمارے معاشرے کے بارے میں ہماری کتب اور اخبارات و جرائد کے ذریعے سے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یہی سمجھ بیٹھتا ہے کہ پاکستانی معاشرہ اپنے آپ کو فخر کرنے والا اور انصاف پسند معاشرہ ہے جو حقیقتاً اچھائی پر مبنی ہے۔ ہمارے اپنے شہری بھی بہت برا مان جاتے ہیں اگر پاکستانیوں میں عزت، غیرت اور دیانتداری کے فقدان کی بات کی جائے جنہیں ہم بہت عزیز جانتے ہیں۔

کیا ہمارا معاشرہ یہ تمام تصورات اپنے اندر رکھتا ہے؟ اور اگر اس میں یہ تمام تصورات یا اقدار پائی جاتی ہیں تو کیا معاشرے کا معیار بہتر ہوا ہے یا نہیں۔ مجھے اس قسم کے خیالات نے کافی عرصہ گھیرے رکھا جب حال ہی میں مجھے لاہور کے طبقہ اعلیٰ کے ساتھ ایک ڈنر کرنے کا موقع ملا۔ ایک پرانے دوست نے ایک شام مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی اور یہ بھی بتایا کہ مجھے لاہور کی سوسائٹی کے بہت سے معروف لوگوں سے ملاقات کا موقع ملے گا۔ وہ بہت خوشگوار شام تھی کھانے پر بہت سے لوگ مدعو تھے جن میں سے بعض بہت شائستہ، پڑھے لکھے اور رکھ رکھاؤ والے تھے۔

ڈنر سے اگلے روز میزبان سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں پچھلی رات کو آئے ہوئے مہمانوں کا تذکرہ ہوا۔ تب مجھے اپنے ملک کے طبقہ امراء کے چند نمائندوں کے بارے میں جن باتوں کا پتہ چلا تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی اور میں اپنے معاشرے کی پاکبازی اور اس معاشرے کے ستونوں کے بارے میں حقائق جان کر ششدر رہ گیا۔ مختصراً ان مہمانوں کے بارے میں بتا دینا میرے خیال میں نامناسب نہ ہوگا۔

میری ملاقات ایک معروف صنعتکار سے ہوئی جنہوں نے اپنا ابتدائی سرمایہ بڑی مشکل سے ''پھیرے لگا کر'' اکٹھا کیا تھا۔ وہ صاحب ان خدمات کا بڑی شدومد سے ذکر کرتے تھے جو ان کی صنعت ملک کے لئے انجام دے رہی تھی اور جس کے اعتراف میں وزیرخزانہ نے زبانی طور پر انہیں ٹیکسوں سے مزید چھوٹ دینے پر رضامندی کا اظہار کر لیا تھا یاد رہے کہ انہیں پہلے بھی ٹیکسوں سے خاطرخواہ چھوٹ حاصل تھی انہوں نے حکومتی اداروں سے کئی قرضے لئے ہوئے تھے اور انہیں نہ ادا کیا تھا نہ ہی ادا کرنے کا کوئی ارادہ تھا۔ اس کے باوجود کہ ان کا معیار زندگی بہت ہی بلند تھا' مرسیڈیز' بہت بڑا گھر نہ صرف ملک کے ہر بڑے شہر میں داشتائیں بلکہ یورپ میں بھی انہیں یہ سہولت میسر تھی لیکن اپنی یادداشت میں انہوں نے کبھی ٹیکس نہ دیا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے اپنے ٹیکس ریکارڈ میں وہ گھاٹا دکھائے چلے آ رہے تھے۔

ایک اور صاحب جو دعوت میں تشریف لائے اور مجھے ملاقات کا شرف بخشا وہ پراپرٹی کے کاروبار کے بے تاج بادشاہ تھے اور اس بے تاج بادشاہت تک پہنچنے کیلئے ان گنت فراڈوں میں ملوث ہوئے مگر پکڑے نہ گئے۔ ان صاحب نے کئی ہوائی لینڈ ڈیولپمنٹ سکیمیں بنائی جو دس سال کے بعد بھی حقیقت کا روپ نہ دھار سکیں۔ وہ کئی فنانس کمپنیوں اور کوآپریٹو بنکوں کے بھی مالک تھے جن کے کھاتے دار ابھی تک اپنی رقوم کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ کامیابی سے حکومت کی زمین کو ہڑپ کیا اور ان کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اپنی ان سرگرمیوں کی وجہ سے وہ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ سیاست میں کود جانے کے اہل ہیں۔ انہیں اس بات کا پکا یقین تھا کہ اپنی دولت اور فراست کے بل بوتے پر وہ آسانی سے منتخب ہو جائیں گے۔

ایک صوبائی وزیر بھی دعوت میں تشریف فرما تھے جو اپنی خاندانی جاگیر میں مزارعوں پر ظلم و ستم کرنے میں شہرت رکھتے تھے۔ صوبائی کابینہ میں تھوڑے وقت کے لئے جگہ پا لینے کے بعد اب وہ اپنے عارضی عہدے کے بل بوتے پر زیادہ سے زیادہ دولت اور جائیداد بنا لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ

کواپریٹو کے سکینڈل میں ملوث ہونے کے علاوہ انہوں نے کئی صنعتیں بھی لگا لی ہیں۔ان کی کئی ناجائز سرگرمیوں کا ذکر اخبارات میں بھی ہوا لیکن وہ اس سے پریشان یا پشیمان بالکل نہ ہوئے بلکہ انہیں ان کی ضمیر فروشی کے افشا ہو جانے پر راحت محسوس ہوئی اس شام انہوں نے حکومت کے نامہ نگار کے فرائض بطریق احسن نبھائے اور صوبے کے امن وامان کو نہایت تسلی بخش قرار دیا جس کی وجہ سے ان کا موقف تھا کہ ان کی پارٹی کے عرصہ اقتدار میں اضافہ کر دیا جانا چاہئے۔وزیر صاحب جس بات کا اظہار نہ کر سکے وہ یہ تھی کہ دراصل انہیں اپنی جیبیں بھرنے کے لئے مزید وقت ملنا چاہئے۔

ایک سینئر بیوروکریٹ بھی اس شام دعوت میں براجمان تھے۔ان صاحب نے اپنے کیریئر کا آغاز معمولی حیثیت سے کیا لیکن اب وہ صنعتکار بھی تھے اور پراپرٹی کا کاروبار بھی کر رہے تھے۔خدا کے فضل وکرم سے ان کا بیٹا جو امریکہ سے تعلیم حاصل کر کے لوٹا تھا اب یہاں پیسے بنانے میں کافی ماہر ہو چکا تھا۔بیوروکریٹ موصوف کو اپنی نوکری کے دوران جو بھی موقع ملا انہوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔کمیشن لینے۔رشوت لینے۔ناجائز کاموں کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے' ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کا انتظام کرنے' پلاٹوں کا سستے داموں حصول' قرضے لے کر واپس نہ کرنے' صنعت لگانے کے لائسنس لینے اور دوسری چیزوں کے ساتھ حکومت کی طرف سے کی جانے والی خریداریوں میں سے پیسہ اڑا لینے پر انہیں بہت قدرت حاصل تھی یہ کم گو شائستہ اور دوربین شخص بہت احتیاط سے دوسرے لوگوں سے کام نکلوانا جانتا تھا۔

طبقہ اعلیٰ کی کوئی بھی تقریب یا پارٹی مغرب کی نمائندگی کے بنا مکمل نہیں ہوتی۔باہر کے ممالک کے ثقافتی مراکز میں کام کرنے والے دو چھوٹے سفارتکار بھی وہاں موجود تھے۔امریکہ کا کونسل جنرل بھی کچھ دیر کے لئے آیا۔اس کا انداز نہایت شاہانہ تھا اور میزبان کا اس کے ساتھ برتاؤ بھی ایسا ہی تھا جیسے کہ وہ اصلی وائسرائے ہو۔گوری چمڑی والوں کی اس کے باوجود کہ وہ تضحیک آمیز رویہ اپنائے ہوئے تھے بہت آؤ بھگت کی گئی۔اور اگر وہ غلط دلائل بھی دے رہے ہوتے تب بھی ان کے ساتھ بہت مودبانہ برتاؤ روا رکھا جاتا اور بیجا تعظیم کی جاتی تھی۔ان چھوٹے درجے کے سفارتکاروں کے ساتھ چاپلوسی اور خوشامد والے برتاؤ کا عقدہ مجھ پر اس وقت کھلا جب میرے دوست نے مجھے بتایا کہ یہ سفارتکار مقامی لوگوں کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔یہ لوگ مقامی طبقہ اعلیٰ کے افراد کو ڈیویلپمنٹ ایڈ فنڈز لے کر دلا سکتے ہیں یا ویزا جلدی لگوا کر دلوا سکتے ہیں اور عام طور پر ممنوع اشیاء خاص طور پر شراب مہیا کر سکتے ہیں۔

وہاں ایک بیہودہ سے ڈاکٹر صاحب بھی آئے ہوئے تھے جو اپنے پیشے اور نئی نئی اپنائی ہوئی تہذیبی تصنع کے مسلسل اظہار سے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اپنے کافی لمبے کیریئر کے دوران ہر طرح کی قوتوں (ملکی و غیر ملکی) کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرنے میں ممتاز تھے۔ ان صاحب نے سیاستدانوں کی چاپلوسی کر کے مقامی طور پر بہت اثر ورسوخ حاصل کر لیا تھا ان کا انتظامیہ سے بھی بڑا پُر اسرار سا تعلق تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے بھائی بہنوں اور دیگر عزیزوں سے جائیداد ہتھیا لی تھی۔ اس شام موصوف نے وہاں پر موجود سفارتکاروں کی خوشامد کی حد کر دی محکمہ امور خارجہ کے لئے اپنی خدمات گنوانے میں انہوں نے اپنی زبان و بیان کی تمام توانائیاں صرف کر دی تھیں۔

ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے نوجوان مینجر بھی وہاں موجود تھے جو پاکستان کے طبقہ اعلیٰ میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ ان کے والد نے نوآبادیاتی انتظامیہ کے لئے خدمات سرانجام دیں اور یہ صاحب ملٹی نیشنل کیلئے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زبان و بیان کے ماہر ہونے کے علاوہ ان میں اپنی ملٹی نیشنل کمپنی کے ذریعے دوسروں پر احسان کرنے کی قدرت بھی تھی۔ انہیں اپنی اس قدرت کو اپنے سماجی تعلقات کے ساتھ جو کہ انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملے تھے یکجا کرنے کا فن بدرجہ اتم آتا تھا۔ چنانچہ ان تمام فوائد کو جو انہیں میسر تھے معاشرے میں اپنے لئے باعزت مقام حاصل کرنے کیلئے انہوں نے بڑی سمجھ داری سے استعمال کیا تھا اور نہ صرف سماجی لحاظ سے بلکہ معاشی لحاظ سے بھی ان کا مقام اب کافی بلند ہو گیا تھا۔ چنانچہ اب ان کا معاشرے میں اعلیٰ مقام تھا اور انہیں ملٹی نیشنل کے باعزت ملازم کی حیثیت سے طبقہ اعلیٰ میں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

ان حضرات کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی اس دعوت میں شریک تھا جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ''جو محض خوشامد اور حاشیہ برادری کرتے ہیں وہ بھی ایک خدمت سرانجام دیتے ہیں۔'' کئی حضرات نے تو اس دعوت میں شرکت کرنے کیلئے دعوتی کارڈوں کی بذات خود فرمائش کی تاکہ وہ وہاں آ کر اپنے سماجی تعلقات میں اضافہ کر سکیں یہ لوگ اہم شخصیات کے سامنے بچھے بچھے جاتے تھے اور انہیں بڑے ہی اہتمام سے ''سر'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ انہوں نے ساری شام یہی کوشش کرتے گزاری کہ کسی طرح ان ''کامیاب'' شخصیات سے ہونے والی شناسائی مستقبل میں مستقل تعلق کا روپ دھار لے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر اپنی نام نہاد ''عزت دار'' اور ''غیرت مند'' سوسائٹی کے بارے میں اپنے دوست سے حیرانی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اس کی توجہ ان حوالوں کی طرف مبذول کرائی جو ہمارے ادب اور لوک کہانیوں کا حصہ ہیں اور وہ اقوال جو ہمارے بزرگ ہمیں سنائے کرتے تھے وہ بھی اسے سنائے جو اس قسم کے لوگوں سے متعلق تھے جن کی موجودگی سے مجلس مہذب بن جاتی تھی۔ تقریباً ہر معاشرے میں کوئی بھی شخص اگر غیر اخلاقی حرکت کرتا تھا تو اس سے سب ناطہ توڑ لیتے تھے۔ کسی بھی گھناؤنے عمل کا شک ہو جانے کی صورت میں مشکوک شخص کو سماجی مقاطعے کے ڈر سے کسی دوسرے علاقے میں چلے جانا پڑتا تھا۔ اس کا تو تصور ہی نہ ہو سکتا تھا کہ ایک معقول اور شریف آدمی سمگلروں' بے ایمان سیاستدانوں' بیوروکریٹوں اور ٹھگوں کو نہ صرف اپنے گھر بلائے بلکہ ان کے ساتھ اپنے تعلق پر فخر کرے۔ کیا ایسے لوگ اپنے آپ کو شریف اور باعزت کہہ سکتے ہیں۔

میرے دوست نے میری یہ باتیں بڑے صبر و تحمل بلکہ مشفقانہ انداز سے سنی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ پاکستان میں چونکہ تمام ادارے اور قانون یکسر بے اثر ہو گئے ہیں اس لئے یہاں صرف پیسہ اور پیسے کی طاقت ہی واحد حقیقت ہے چنانچہ اس میں حیرانی کی بات نہیں کہ لوگوں میں صرف دولت کی عزت ہے بیشک یہ دولت کسی بھی ذریعے سے حاصل کی گئی ہو۔ وقار' عزت اور غیرت اب ایسی قدریں ہیں جنہیں با آسانی خریدا جا سکتا ہے۔ اب تو دولتمند ہی عزت اور غیرت والے ہیں اور انہیں عزت نہ دینا نہ صرف خطرناک بلکہ خودکشی کے مترادف ہے۔ آخر کار پاکستان میں امراء کی حکومت ہے جنہیں خود حکومت نے بنایا اور اب وہ خود حکومت میں ہیں ہم جیسے ادنیٰ لوگ ان کی پوجا نہ کریں تو جئیں کیسے؟ منافقت کو مصلحت کوشی کا نام دے دیا گیا ہے۔ اور یہ بلند بانگ دعوے اور نعرے تو محض غریبوں اور ان پڑھوں کو بیوقوف بنانے کیلئے ہیں ان کا اس کے علاوہ کچھ مصرف نہیں۔

(19)

طبقہ اعلیٰ اور غیر سرکاری تنظیمیں

پاکستان میں یہاں کے طبقہ اعلیٰ کو اپنی بقاء کو قائم رکھنے کا فن بخوبی آتا ہے۔اس نے اپنے آپ کو بدلتے تقاضوں کے مطابق بڑی عمدگی سے ڈھالا۔خواہ کوئی حکومت میں کیوں نہ ہو یا کسی غیر ملکی ماہر کی نئی سوچ نے حالات کے رخ میں تبدیلی پیدا کر دی ہو ہمارے طبقہ اعلی کے اراکین ہر صورت اور ہر طرح کے حالات میں پیسہ اور طاقت سے ایسے وابستہ و پیوستہ ہو جائیں گے جیسے شہد کی مکھیاں شہد سے پیوست ہو جاتی ہیں۔ ہماری مختصر تاریخ گواہ ہے کہ اس طبقے نے ہمیشہ بڑی تیزی سے پیسہ اور شہرت حاصل کرنے کے نئے طریقے اور گر تلاش کر لئے۔متوسط طبقہ جو کہ طبقہ اعلیٰ کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ ہمیشہ ان طریقوں کو پا لینے میں دیر کر دیتا ہے اور اس کے لئے یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب طبقہ اعلیٰ آگے بڑھ چکا ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ جب متوسط طبقہ دولت و شہرت کے وہ طریقے دریافت کر لیتا ہے جو پہلے طبقہ اعلیٰ کے زیر استعمال تھے تو طبقہ اعلیٰ آگے بڑھنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے جس میں اکثر اسے کامیابی ہوتی ہے۔

اس صدی کی پانچویں دہائی کے دوران ہر طرف سول سروس کا غلغلہ تھا۔کسی بھی نوجوان کے لئے اس نوزائیدہ ملک میں شہرت طاقت اور کسی حد تک معقول مقدار میں دولت کے حصول کا یہ واحد ذریعہ تھا۔طبقہ اعلیٰ کے نوجوان بہترین تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد سول سروسز اکیڈیمی میں جا گزیں ہوتے۔ان کے لئے صرف یہی ضروری تھا کہ وہ اچھے دکھائی دیں اچھی گفتگو کریں اور اپنا حکم چلائیں۔عوام کی خدمت کرنے کا بار ان کے کندھوں پر ہرگز نہ تھا۔حکومت بھی انہی کی خدمت کیلئے ہوتی تھی نہ کہ وہ حکومت کی خدمت کیلئے۔

چھٹی دہائی کے آخری ایام تک نچلے طبقہ کے نوجوان بھی جاہ طلبی کی خواہش اور محنت و لگن کے بل بوتے پر سول سروس میں آنا شروع ہو گئے۔اب مقامی ادارے جو پہلے طبقہ اعلیٰ کے نوجوانوں

کو پروان چڑھاتے اب دوسرے طبقوں کے تصرف میں بھی آنا شروع ہو گئے۔ اب نسبتاً غریب اور کم سہولتوں والے لوگ بھی ان اداروں میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اس طرح حاکم اور محکوم میں فرق کم ہونا شروع ہو گیا۔

اس مسئلے کا حل بہت آسان تھا۔ اونچے طبقوں نے ان اداروں میں اپنے بچوں کو بھیجنا ترک کر دیا اور وہ انہیں باہر کے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم دلانے لگے۔ اس کا نتیجہ طبقہ اعلیٰ کے لئے بہت اچھا نکلا کیونکہ کیمبرج اور اکسفورڈ کی تہذیب نے ان کے بچوں اور نچلے طبقوں کے بچوں میں فرق کو برقرار رکھا۔ اور یہ فرق دوچند اس طرح بھی ہو گیا جب مقامی اداروں میں زوال آنا شروع ہو گیا اور اس زوال کو روکنے کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا محض اس لئے کہ اب وہاں طبقہ اعلیٰ کے بچے تعلیم حاصل نہ کرتے تھے اور انہیں اداروں کی اب کوئی ضرورت نہ تھی۔

اسی طرح نچلے طبقوں کی آگے کی طرف پیش قدمی جاری رہی اور اب طاقت میں شراکت یا جمہوریت کی ضرورت سے منہ موڑنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ اسی لئے بھٹو صاحب نے 1973ء کے دوران سول سروس میں اس طرح کی اصلاحات متعارف کروائیں کہ ان کی برتری ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی اب نچلے طبقوں سے بہت بڑی تعداد میں لوگ سول سروس میں شامل ہونے لگے۔

طبقہ اعلیٰ نے ان حالات میں سول سروس میں جانا ہی ترک کر دیا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ سول سروس میں آنے والے شخص کے سماجی و اقتصادی پس منظر، تعلیم اور شائستگی میں تبدیلی (کمی) کے باعث سول سروس کے نظام میں انحطاط آنا شروع ہو گیا کیونکہ طبقہ اعلیٰ کے لوگ اب سول سروس میں نہ جاتے تھے۔

سول سروس کو داغ مفارقت دینے کے بعد تہذیب و تعلیم سے آراستہ طبقہ اعلیٰ کے نوجوانوں کیلئے متبادل کیا ہو؟ ابھی یہ سوال فضاؤں میں محوگردش ہی تھا کہ ملٹی نیشنل تنظیموں کی نظر ان امیر کبیر گھرانوں کے فرزندوں پر پڑی۔ انہیں بھی ان نوجوانوں کے اثر و رسوخ۔ تعلیم و تربیت اور خاندانی دولت سے فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آیا۔ چنانچہ ساتویں دہائی کے وسط تک طبقہ اعلیٰ کے نوجوان ملٹی نیشنل تنظیموں میں ملازم ہونا شروع ہو گئے اور وہ لڑکے جو کہ مقابلے کا امتحان کی تیاری میں مصروف تھے یکا یک امتحان کو بھول بھلا کر بی سی سی آئی، سٹی بنک، بینک آف امریکہ اور آئی سی آئی جیسے اداروں کے دروازوں پر دستک دینے میں مصروف ہو گئے۔ اور ملٹی نیشنل تنظیمیں بھی نہ صرف انہیں ملازمتیں فراہم کرنے لگیں بلکہ ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے لگیں جو ان کے شایان شان

تھا۔ یہ غیر ملکی تنظیمیں پاکستان میں ان کے تعلقات، معاشرے میں اعلیٰ مقام اور بہترین تعلیم سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہ تنظیمیں ساتویں اور آٹھویں دہائی کے دوران بہت تیزی سے پھیلتی ہوئی دکھائی دیں اور ان کا پاکستان میں کاروبار بھی بہت منافع بخش رہا۔

اسی دوران آٹھویں دہائی کے دوران ایک اور روایت چل نکلی اس وقت تک سول سروس زوال پذیر اور سرکاری شعبہ کرپٹ ہو چکا تھا یوں بھی سرکاری شعبے کی عمر بہت زیادہ ہوگئی تھی اور اب وہ اثاثے کی بجائے ذمہ داری بن گیا تھا۔ اس شعبے میں کام کرنے والے انتہائی نااہل ہو چکے تھے۔ اب حکومت کا بھی ایک ہی مقصد دکھائی دیتا تھا کہ ٹیکسوں میں اضافہ کرتی رہے اور طبقہ امراء کے مفادات کی نگرانی کرے اب حکومتی حلقوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے والے طبقہ اعلیٰ کے اراکین نے حکومتی اداروں کو بہت عمدگی سے اپنے فوائد کیلئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نتیجے کے طور پر منافع خوری کا کاروبار (Rent Seeking) جو پہلے ابتدائی مراحل میں تھا اب ایک پوری صنعت بن گئی اور سفید پوشی کے جرائم (White Collar Crime) مقبولیت پانے لگے۔ ڈسٹری بیوٹرز اور ایجنٹ (غیر ملکی کمپنیوں کے) ہر طرح کے آلات خواہ ان کی کوئی افادیت ہو یا نہ ہو حکومت کو فروخت کرنے میں ماہر ہو گئے۔ یہ آلات بہت مہنگے داموں حکومت کو فروخت کئے جاتے تھے۔ ایک اور کام جو طبقہ اعلیٰ کے افراد کرنے لگے وہ قومیائے گئے مالیاتی اداروں سے قرض لینا تھا اور اس کے بعد وہ ہر ممکن کوشش یہی کرتے کہ وہ قرض انہیں واپس نہ کرنا پڑے اسی لئے فنانس کمپنیوں اور کوآپریٹوز جیسے سیکنڈل زیادہ تواتر کے ساتھ ہونے لگے اور ان سکینڈلوں میں ملوث افراد کو کسی قسم کی سزا کا کوئی خوف نہ ہوتا تھا۔

بالآخر آٹھویں دہائی بھی اختتام پذیر ہوگئی بی سی سی آئی پکڑا گیا۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی ہمیشہ اپنی ترقی کی رفتار برقرار نہ رکھ سکتی تھیں۔ پیٹرڈالروں کی بہتات بھی نہ رہی اور دو طاقتی (Bi polar) دنیا بھی تاریخ کی کتب تک محدود ہوگئی اس لئے امریکی امداد بھی بند ہوگئی۔ چونکہ حکومت نے خطیر رقوم بین الاقوامی مالیاتی ایجنسیوں سے قرض کے طور پر لی ہوئیں تھیں چنانچہ ان ایجنسیوں نے حکومت کو اپنی فیاضانہ سرگرمیوں سے پرہیز کرنے پر مجبور کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی نوکریاں بھی بہت کم ہوگئیں بینکوں سے قرضے ملنا بھی مشکل ہو گئے اور حکومت کو غیر ضروری آلات مہنگے داموں فروخت کرنا بھی ممکن نہ رہا۔

جیسا کہ طبقہ امراء کی قسمت کا ستارہ ہمیشہ سے رو بہ عروج رہا چنانچہ انہیں ایک اور موقع

ملا۔اس دفعہ ڈونر ایجنسیوں اور ترقی پسند مفکرین (Dots) بہت عرصے سے ترقی کی خاطر حکومت پر ہی انحصار کرتے چلے آ رہے تھے لیکن حکومت کی کارکردگی چونکہ انتہائی مایوس کن تھی اس لئے اب ایک متبادل طریقہ وضع کر لیا گیا جسے ''شراکت'' (Participation) کا نام دیا گیا۔ یہ (شراکت) اس لئے وجود میں آئی کیونکہ ترقی کیلئے حکومت اور ترقی پسند مفکرین نجی شعبہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور اس سے عناد بھی رکھتے تھے نئی وضع کردہ حکمت عملی میں بظاہر جو سوچ کارفرما تھی اس کے مطابق حکومت فیصلوں میں لوگوں (عوام) کو بھی شریک کرے گی لہذا حکومت نے لوگوں سے مشورہ کرے اپنے پسندیدہ افراد کو کنٹریکٹ (ٹھیکے) دیئے۔

طریقہ ہائے شراکت ابھی طے ہونا باقی تھے چونکہ ترقی پسند مفکرین (Dots) عام طور پر نجی شعبے اور منافع سے عناد رکھتے تھے۔ لہذا انہوں نے حکومت کو نجی شعبے کا متبادل تجویز کیا جو کہ منافع کے بغیر تنظیم تھی (Non profit organisation) اور حکومت کے ساتھ لوگوں کی شراکت کا یہ بنیادی مرحلہ تھا ایسی تنظیموں کا مناسب نام گھڑ لیا گیا اور انہیں non government organisation یا این جی او کہا جانے لگا۔ جیسا کہ ترقی پسند مفکرین چاہتے تھے اس طرح این جی اوتنظیمیں بالکل حکومت کی طرح کسی کو جوابدہ نہ تھیں اور نہ ہیں۔ جب تک انہیں فنڈ ملتے رہیں اس وقت تک وہ قائم رہتی ہیں اور وہی کرتی ہیں جو وہ چاہتی ہیں کسی بھی پرائیویٹ یا سماجی افادیت کو خاطر میں لائے بغیر۔

اپنی اس طرح کی سوچ پر عمل کرتے ہوئے ڈونر ایجنسیوں نے این جی اوتنظیموں کے زیادہ سے زیادہ قیام کی حوصلہ افزائی کی۔ فنڈ کی فراہمی چونکہ زیادہ مشکل نہ تھی لہذا طبقہ اعلیٰ کے پڑھے لکھے افراد نے زیادہ سے زیادہ ان موقع سے فائدہ اٹھایا اور پیسے بنائے۔ گلبرک' ڈیفنس اور اسلام آباد کے ایف اور جی سیکٹر کے تمام گھر این جی اوتنظیموں کے دفاتر بن گئے۔ اگر ایک دفعہ کوئی ڈونر قائل ہو جائے تو پیچھے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ این جی او تنظیم وجود میں آ جاتی ہے اس کے بعد اس تنظیم کی صحت اور ترقی کا دارومدار اس کے بانیوں کی چرب زبانی پر ہوتا ہے۔

یہ این جی اوتنظیموں کی دہائی ہے۔ این جی اوتنظیموں ہی پر دنیا بھر میں بڑی بڑی رقوم خرچ کر کے کانفرنس منعقد کی جاتی ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو دیکھنے اور گفتگو کرنے میں اچھے ہوتے ہیں فائیو سٹار ہوٹلوں کی لابیوں میں ڈونرز کے ساتھ شراکت پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں بھاری لاگت سے لمبی لمبی مشاورتی رپورٹیں جو کہ این جی او تنظیمیں دوسری این جی اوتنظیموں پر تیار کی

جاتی ہیں۔اس طرح سے طبقہ اعلیٰ نے ایک مرتبہ پھر اپنی مستعدی ثابت کر دی ہے۔ وہ این جی او تنظیموں کی طرف سے فراہم کردہ موقعوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن پہلے کی طرح اس طبقے کے ٹھاٹھ باٹھ کا بل پاکستان کی عوام ہی کو چکانا پڑے گا جب ڈونرز سے قرضوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے گا۔

میرے لئے اب صرف دلچسپی ایک ہی بات میں ہے کہ این جی او تنظیموں کے بعد سونے کا انڈہ دینے والی کونسی مرغی ہوگئی جو طبقہ اعلیٰ کے لئے پرتعیش زندگی کو ممکن بنائے گی۔

(20)

میں نے جلاوطنی کیونکر اختیار کی؟

میں ایک نوازائیدہ ملک میں اس وقت پیدا ہوا جب دنیا بھر میں بعداز جنگ عظیم دوئم تعمیرنو کا کام جاری تھا اور سرد جنگ اپنے عروج پر تھی۔ اس طرح میں ایک ایسے ملک میں پلا بڑھا جو خود اسی مرحلے میں تھا۔ میرے بچپن کے دنوں میں اس نوزائیدہ ملک کی فضا قوم پرستی اور مثالیت (Idealism) سے پر تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آزادی نے اچھائی کی تمام قوتوں کو آزاد کر دیا ہو۔ شاعر بڑی بلاغت اور فصاحت سے مژدہ سناتے تھے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم ہونے والا ہے جیسا نہ پہلے کبھی تھا اور نہ کبھی آئندہ وجود میں آئے گا۔ انہی دنوں نئے قومی ہیرو تشکیل دیئے جا رہے تھے ایسے ہیرو جو کہ زندگی کی حقیقت سے بھی عظیم تر تھے جو اچھائی کا مرقع اور بدی کے خلاف مجاہدہ کرنے میں بے مثل تھے۔ مختصر یہ کہ میری نسل کی پرورش انتہائی مثالیت پسندی اور اخلاقی اقدار کے سائے تلے ہوگی۔

بعداز جنگ ہونے والی تعمیرنو اور میرے ملک میں سماجی، سیاسی اور معاشی سطح پر ہونے والی ابتدائی ترقی ایک ساتھ ہی ہوئی۔ تب ہمیں یہ بتایا گیا کہ ہمیں حکومت پر ہر طرح کا اعتماد رکھنا چاہئے کیونکہ وہی ہمارے تمام مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ ہمیں اپنی تمام توانائیاں ملک کی خدمت میں صرف کرنی چاہئیں۔ یہ جذبہ جسے ہم سب ایک دوسرے میں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے صدر جان ایف کینڈی کے اس تاریخی جملے سے بہتر طور پر واضح ہوسکتا ہے ''مت پوچھو کہ تمہارا ملک تمہارے لئے کیا کر سکتا ہے بلکہ یہ بتاؤ کہ تم ملک کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہو۔'' ملکی تعمیرنو کے لئے یہ جذبہ لازمی تھا۔ تب اصراف کو بری نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ہمیں زیادہ سے زیادہ بچت کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور بچت کر کے رقم حکومت کے حوالے کر دینے کو کہا جاتا تھا۔ ہمیں کفایت شعاری کے فوائد کو پسند کرنے کو کہا جاتا جبکہ سرکاری شعبہ اور اس کے حمایتی ہمارے خرچ پر پھلتے پھولتے رہے۔

سرد جنگ نے مجھ پر اور میری نسل کے لوگوں پر دو طرح کے اثرات مرتب کئے ایک تو مسلسل یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ یہ دنیا بالکل فنا نہ ہو جائے۔ میڈیا فریقین کی طرف سے ہونے والے

پراپیگنڈے اور نعرہ بازی سے بھرا ہوتا ہے جو میرے ناپختہ ذہن کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ میں سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ نجانے میرے بڑے ہونے تک یہ دنیا رہے گی بھی یا نہیں۔ کئی دفعہ تو میں سکول کا کام بھی نہ کرتا کیونکہ مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ چند دن بعد میری موت یقینی ہے تو کام کرنے سے فائدہ! مجھے بم کے خوف پر قابو پانے میں کافی وقت لگا۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ ان دنوں جب سرد جنگ زوروں پر تھی تو امریکہ نے پراپیگنڈہ جارحیت کی ابتداء کر رکھی تھی اس قسم کا شدید پراپیگنڈہ دنیا نے پہلے کبھی دیکھا یا سنا نہ تھا یہ ملک (امریکہ) انسانی ترقی وعظمت کی معراج تک جا پہنچا تھا اور ستاروں کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس پراپیگنڈے اور وہاں کی انسانی ترقی کا سب سے زیادہ اثر آئیڈیلسٹ اور پرتخیل بچوں پر پڑا۔ چنانچہ میں اپنے لڑکپن کے دنوں میں امریکہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا اس کی ایک وجہ سرد جنگ کے دنوں امریکی نعرے اور وہ کردار بھی تھے جو ناپختہ ذہنوں کیلئے بیحد کشش رکھتے تھے مثلاً سپرمین۔ لون رینجر کول ایڈ مارز باز وغیرہ۔ بدقسمتی سے دوری اور تھوڑی بہت کتب سے جو کہ ملک میں لانے دی جاتی تھیں اور ٹیلی ویژن کی عدم موجودگی میں میرے ذہن پر امریکہ کا جو تاثر قائم ہوا اس میں امریکہ کے حق میں انتہا درجے کا تعصب پایا جاتا تھا۔ اس طرح میں یہ خواہش بلکہ حسرت لئے بڑا ہوا کہ کاش میں امریکہ میں ہوتا۔ میں نے امریکہ کیلئے رومانوی قسم کے خیالات وضع کر لئے تھے جن پر آج جب میں غور کرتا ہوں تو جب آج میں امریکہ میں رہائش پذیر ہوں جو ان خیالات وتصورات سے بالکل الٹ ہیں جو میرے ذہن میں ان دنوں جاگزین تھے۔

ان تمام اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنی نسل کے دوسرے نوجوان کے ساتھ بہت سے غلط تصورات لئے بڑا ہوا۔

(الف) ہم سب مثالیت پسند تھے اور دنیا کو تبدیل کرنا چاہتے تھے۔

(ب) ہم سب اخلاقیات پسند بھی تھے اور سمجھتے تھے کہ ہر قسم کے حالات میں اخلاقیات کا راستہ ہی فلاح کا ضامن ہوتا ہے۔

(ج) ہم دانش پر یقین رکھتے تھے اور محسوس کرتے تھے کہ تمام مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یقین واثق تھا کہ دنیا کے مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری بہتر ہے کہ دانشوروں پر چھوڑ دی جانی چاہئے۔

(د) ہمیں حکومت پر ہر طرح کا بھروسہ تھا جو کم از کم زبان کی حد تک تمام برائیوں کے خلاف

مصروف جہاد نظر آتی تھی۔

(ر) سب سے آخر میں ہم نے مغرب اور امریکہ کے بارے میں رومانوی تصورات تشکیل دے لئے تھے۔

چنانچہ چابی کے کھلونے کی مانند میں امثالی اخلاقیات کے راستے پر چل نکلا۔ اپنے لڑکپن اور نوجوانی کے ایام میں میرا محنت اور علمی و ذہنی بہتری (Intellectual Excellence) پر پختہ اعتقاد تھا۔ تب میں کبھی اپنے گرد بدلتی ہوئی دنیا سے نہ گھبرایا حالانکہ سرد جنگ کے دنوں وجود میں آ جانے والی اخلاقیات بھی کمزور پڑتی جا رہی تھی اور صحیح اور غلط میں فرق بھی مٹتا چلا جا رہا تھا۔ وہ یوٹوپیا جو نئی آزاد ہونے والی نوآبادی میں قائم ہونا تھا اس کے امکانات دور دور تک دکھائی نہ دیتے تھے حکومت اب لوٹ مار پر اتر آئی تھی۔ ڈکٹیٹر طاقت کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریبان تھے۔ رہنما اور حکومتی اہلکار جن کے اردگرد ابتدائی زمانے میں تقدس کا ہالہ قائم تھا اب وقت گزرنے کے ساتھ کسی بھی عام ٹھگ یا چکرباز سے مختلف دکھائی نہ دے رہے تھے۔ اخلاقیات اور ترقی کا مظہر۔ امریکہ بھی ویت نام میں مظالم کی داستان رقم کر رہا تھا اور اس عظیم ملک میں بھی زوال کی آمد آمد تھی۔ لہذا میری اخلاقیات اور مثالیت کی دنیا بھی بکھرتی جا رہی تھی۔

میں اور میری نسل کے دوسرے لوگ اپنے آپ کو عوام اور ملک کی خدمت کرنے کیلئے تربیت دے رہے تھے۔ ملک کی عظمت، طاقت اور شہرت نے ہمیں بہت متاثر کیا تھا۔ جب ہم اس مقصد کیلئے تعلیم حاصل کر رہے تھے جو ہمارے سامنے تھا تبھی حکومت کے کردار میں تبدیلی آ گئی۔ جلد ہی ہم نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ حکومتیں وہ نہیں ہوتیں جو ہم سمجھتے ہیں۔ یہ تو محض کرپٹ نوکر شاہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں جو طاقت اور عوام کے پیسے کا غلط استعمال کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ سول سروس جو نوآبادیاتی دنوں میں انصاف، ترقی اور موثر انتظامیہ کا بڑا ذریعہ تھا اور جس میں بہترین اور اخلاقی طور پر بلند و باکردار لوگ جایا کرتے تھے اب ان تمام خوبیوں سے محروم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

میری نسل سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں نے بہتر تعلیم حاصل کر کے لوگوں کی خدمت کا جذبہ دلوں میں لئے ہوئے یہ سمجھا کہ وہ ملک کی بہتر طور پر خدمت معلم یا ماہر تعلیم بن کر ہی کر سکتے ہیں۔ ایسے ملک میں جہاں خواندگی کی شرح دنیا میں سب سے کم ہو اور ماہرین تعلیم کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی ہو وہاں ہماری سوچ کے مطابق تحقیقی کام اور تعلیم کے مناسب انتظام کی سب سے

زیادہ ضرورت تھی۔ہم نے اپنے بھولے پن کی وجہ سے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ تعلیم پھیلا کر تبدیلی کا راستہ بہتر انداز میں ہموار کیا جاسکتا ہے۔ ہماری آنکھوں میں تب بھی آئیڈیلزم چمک رہا تھا۔

ہم اس آئیڈیلزم میں اس سچ سے چشم پوشی کر رہے تھے کہ جب کسی نظام اور حکومت میں تنزل سرایت کر گیا ہو تو وہاں کا تعلیم نظام بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ہمیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس تعلیمی نظام میں ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں۔نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ویسے بھی تعلیمی نظام کے ناخدا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے جب مجھے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملاقات کے لئے ہفتوں انتظار کرنا پڑا اور جب بالآخر ملاقات ہوئی بھی تو نوکری دینے سے ان صاحب نے مجھے انکار کر دیا جبکہ یہ ایسی یونیورسٹی ہے جہاں ابھی بھی کوئی سنجیدہ معیشت دان نہیں ہے اور آزادی کے بعد سے یہاں کئی خالی جگہیں موجود چلی آ رہی ہیں۔ایک سال تک بے روزگار رہنا مجھے اب بھی یاد ہے۔میرے پاس جو ایک نوکری تھی وہ جز وقتی لیکچر شپ تھی جس کے ماہانہ 120 روپے ملتے تھے اور آجکل کی شرح تبادلہ کے حساب سے یہ صرف 5 ڈالر بنتے ہیں۔

ہم میں بعض جو کہ تعلیم کے نظام میں اپنے لئے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ان کیلئے اور طرح کے مسائل انتظار کر رہے تھے۔تعلیمی انتظامیہ یہ ہرگز نہ چاہتی تھی کہ طلباء کو سنجیدہ اور نئی معلومات مہیا کی جائیں کیونکہ اس طرح تعلیمی نظام اور اداروں پر ان کی گرفت کمزور ہونے کا خطرہ تھا۔ان لوگوں کے ارادوں سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ معاشرے کی تمام کرپٹ قوتیں نہیں چاہتی کہ اس ملک کا نوجوان طبقہ تعلیم حاصل کرے۔ یہ سازش ہی تھی۔تعلیمی اداروں کے کیمپس سیاسی حمایت حاصل کرنے کیلئے استعمال ہوتے۔ذاتی مفاد کی تکمیل کے لئے ان اداروں کو ملنے والے فنڈز کو بھی خرد برد کیا جاتا۔ان اداروں کو جس مقصد کیلئے استعمال نہ کیا جاتا تھا وہ تعلیم تھی۔

ان حالات کے نتیجے کے طور پر طلباء سیاست میں ملوث ہونا شروع ہو گئے اور ان میں تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ بندوقوں اور پستولوں کو کالج کیمپس میں لایا جانا شروع کر دیا گیا اور گولیوں کا تبادلہ روزمرہ کا معمول سا بن گیا۔اساتذہ کو عام طور پر بندوقوں سے یا دوسری طرح کے تشدد سے دھمکایا جاتا اگر کوئی مرد مجاہد تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا تو اوپر سے اسے نفرت اور تحقیر کا نشانہ بنایا جاتا جبکہ طلباء تشدد کے ذریعے سے اس کا جینا دوبھر کر دیتے۔اس طرح کے برتاؤ کے باوجود کچھ لوگوں نے چند ٹکوں کی خاطر اپنے آپ کو اس کام کیلئے وقف کیا۔ہم لوگ نہایت مشکل حالات میں رہ رہے تھے۔ ہر قدم پر مایوسی ہمارا سامنا کرتی بیوروکریسی مذہبی بنیاد پرستی اور تشدد وغیرہ

نے نظام کوتہہ وبالا کر دیا تھا۔اس لئے ہم لوگ سنکی اور بدمزاج سے ہو گئے تھے۔

جونہی ہمیں یہ احساس ہوا کہ اس راستے پر چلنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے تو ہم نے ایک ایک کر کے کیمپس چھوڑنا شروع کر دیا اب ہمارے پاس دو ہی راستے باقی بچے تھے یا تو ملک ہی میں رہ ''روم میں وہی کرو جیسا اہل روم والے کرتے ہیں'' کے مصداق ہم بھی انہی حرکتوں پر اتر آتے جو یہاں پر کامیابی حاصل کرنے کیلئے ضروری ہوتی ہیں یعنی سرکاری ملازمت کر لی جائے اور رشوتیں لے کر اپنی جیبیں بھری جائیں اور پاکستان میں موجود کرپٹ نظام کا حصہ بن جائیں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلے جائیں اور اسی راستے پر چل کر ہم اپنے آئیڈیلز اور اخلاقیات کو باقی رکھ سکتے تھے جن کو ساتھ لے کر ہم جوان ہوئے تھے۔بعض حضرات اس رویے سے یہ بھی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ دوسرا راستہ اپنانے والوں کے پاس اس معاشرے میں رہنے کی سکت ہی نہ تھی۔

ان رویوں کی توجیح جو مرضی کر لیں حقیقت یہ ہے کہ میں اور میرا ملک جنہوں نے ایک ساتھ جنم لیا لیکن بالکل مختلف انداز سے جوان ہوئے۔اچانک میں اور میرے ہمعصروں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ جیسے ہم اپنے ملک میں رہتے ہوئے اس طرح کی زندگی گزارنے کے قابل نہ تھے جس طرح کی زندگی ہم گزارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہمیں ملک کو چھوڑنا پڑا کیونکہ ہم اس ملک کے لئے ان فٹ تھے۔

چنانچہ مجھے نیا گھر ڈھونڈنا پڑا اور نئے گھر کیلئے میرے سپنوں کی زمین امریکہ سے بہتر اور کونسی جگہ ہو سکتی تھی۔ ہم امریکہ کے علاوہ اور کہاں جا سکتے تھے جسے سرد جنگ کے دنوں کئے جانے والے پراپیگنڈے نے ہمارے لئے بہت محبوب بنا دیا تھا۔شاید امریکہ سے اس قدر متاثر ہونے کے بعد اگر میرے ملک میں تنزلی نہ بھی آن دھمکتی تب بھی میں بالآخر امریکہ ہی میں آن بسیرا کرتا۔

(21)

نیشنلزم پر نظر ثانی

کمیونزم کے خاتمے اور اس کے ساتھ ہی سوویت یونین کے ٹوٹ کر بکھر جانے کی وجہ سے کئی نئے ممالک وجود میں آ رہے ہیں۔ دراصل جس تیزی سے روسی ریجن اور مشرقی یورپ میں نئے ممالک وجود میں آئے ہیں تو جنگ عظیم اول سے قبل کے دن یاد آنے لگتے ہیں کیونکہ یہی سب کچھ اس وقت بھی ہو رہا تھا نیشنلزم کو جنم دینے اور اس کی پرورش کرنے والی سرزمین ____ یورپ۔ آج اپنے اس نظریئے سے دور ہوتی جا رہی ہے اور معاشی بنیادوں پر سارا یورپ ایک ملک میں تبدیل ہونے کی سعی کر رہا ہے۔

موجودہ تعریف

اب جب کہ تمام بین الاقوامی کوششیں کئی نئے ممالک کو بیک وقت وجود میں آنے کے لئے ہر طرح سے مدد فراہم کر رہی ہیں ہمیں نیشنلزم کے موجودہ تصورات پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے اور اس پر بھی ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کسی خطہ زمین کو کن بنیادوں پر ''ملک'' کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ تعریف کے مطابق تو ایسا افراد کا گروہ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا کیوں نہ ہو اگر اسے کوئی خطہ زمین میسر آ جائے اور بین الاقوامی دنیا اسے تسلیم کر لے تو وہ ملک کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ وجود میں آ جانے کے بعد تمام ممالک برابر گردانے جاتے ہیں اور ان کے بین الاقوامی سطح پر حقوق بھی برابر ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو آزاد حیثیت میں قرض لینے اور قرض دینے کا بھی حق حاصل ہو جاتا ہے۔

اس طرح کیلیفورنیا میں اورنج کاؤنٹی جو کہ امریکہ میں دوسرے خطوں کی طرح ایک خطہ ہے جس کی فی کس آمدنی اور قدرتی وسائل بہت سے ترقی پذیر ممالک کی فی کس آمدنی اور قدرتی وسائل سے بہت زیادہ ہیں لیکن اس خطے کو بین الاقوامی سطح پر وہ حقوق حاصل نہیں جو ان ترقی پذیر ممالک کو حاصل ہیں۔ مزید برآں اورنج کاؤنٹی بین الاقوامی ایجنسیوں سے قرض بھی نہیں لے سکتی

اور نہ یو این او میں اپنا نمائندہ بھیج سکتی ہے اور نہ ہی قومی ایئر لائن یا کرنسی جاری کر سکتی ہے۔ جبکہ ٹونگا یا مالدیپ جیسے چھوٹے ممالک کو دوسری اقوام کے ساتھ ایک آزاد خود مختار قوم کی حیثیت سے تمام حقوق حاصل ہیں۔

علیحدگی کے فوائد

اگر بین الاقوامی سطح پر موجودہ تعریف ہی کو تسلیم کیا جاتا رہے تب تو حالیہ یونینوں سے مختلف علاقے اگر علیحدگی اختیار کر کے چھوٹے چھوٹے ممالک کی حیثیت اختیار کر لیں تو ان کا فائدہ ہے۔ یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ذاتی مفادات رکھنے والوں کو اس طرح کی علیحدگی سے کتنا فائدہ ہوگا۔ اگر نیا ملک وجود میں آجائے تو وہاں کی حکومت نئے کرنسی نوٹ چھاپ کر اور بین الاقوامی ایجنسیوں سے قرض لے کر اپنے فائدے کے لئے استعمال کر سکتی ہے۔ ان پیسوں سے وہ اپنے اپنے حمایتیوں کو خرید سکتی ہے اور اپنا عرصہ حکومت لمبا کر سکتی ہے۔ اس علاقے کے رہنماء جو پہلے محض ایک شہر کے کونسلر کی حیثیت رکھتے ہوں اب ان کے لئے قومی لیڈر اور پھر بین الاقوامی لیڈر بن جانے کی راہیں کھل جاتی ہیں پہلے وہ سرکاری دوروں پر ساتھ والے شہر تک جا پاتے ہوں اور قومی رہنماء سے وہ بھی کبھی کبھار انہیں ہاتھ ملانے کا موقع ملتا ہو لیکن اب وہ دنیا کے ہر حصے کا دورہ کر سکنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور بین الاقوامی میڈیا کے سامنے پر زور اور بین الاقوامی اہمیت کے مسائل پر تقاریر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان فوائد کے پیش نظر وہ علیحدہ کیوں نہ ہوں؟

آزادی کی قیمت

نیشنلزم کے ساتھ وابستہ حب الوطنی کے جوش و خروش کو ایک طرف رکھتے ہوئے ایک حقیقت پر نظر رکھنی چاہئے کہ مختلف ممالک اور شہروں میں لوگ اس لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں تا کہ وہ مل کر کچھ اشیاء کی پیدائش کو عمل میں لا سکیں اور انہیں خرچ بھی کر سکیں یا کچھ خدمات انجام دے سکیں۔ مثال کے طور پر ہم میں سے اکثر ایسے علاقے میں رہنا پسند کریں گے جو کہ محفوظ ہو خوبصورت ہو اور صاف ستھرا ہو۔ ہم اس علاقے کی انتظامیہ سے یہ بھی توقع کریں گے کہ وہ ہمیں اچھی سڑکیں، سکول، ہسپتال یونیورسٹیاں اور دوسری ضروریات زندگی مہیا کرے۔ بدقسمتی سے ہمارے اکثر قومی رہنماء اپنی تقاریر اور نعروں میں اس بات کا ذکر نہیں کرتے کہ چھوٹے چھوٹے ممالک میں وہ یہ سہولتیں کیسے

فراہم کریں گے۔

ہر جگہ جہاں اچھے معیار کی یونیورسٹی یا ہسپتال قائم کیا جاتا ہے تو یہ بات مدنظر رکھی جانی چاہئے کہ وہاں آبادی کی شرح معقول ہو اور چھوٹے ممالک جن کی آبادی چند ہزار نفوس کی ہو وہاں ایسی سہولتیں مہیا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ جب کوئی بہت ہی چھوٹا ملک شہریوں کو ضرری سہولیات مہیا کرنے کے لئے اپنے ہی لوگوں کو گھٹیا معیار کی خدمات انجام دینے پر مجبور کرتا ہے بجائے اس کے کہ وہ اعلیٰ معیار کی بین الاقوامی خدمات حاصل کرے تو انتہائی مضحکہ خیز صورتحال جنم لیتی ہے۔

اور جب بھی معاصر ڈکٹیٹر کے نام پر کوئی بڑا ہسپتال یونیورسٹی یا بجلی پیدا کرنے کا مرکز تعمیر کرنے کا پروگرام بنتا ہے تو حکومت ملکی ذرائع سے بڑھ کر صرف اس لئے خرچ کر دیتی ہے کیونکہ حاکم وقت کا سالا یا کوئی قریبی ساتھی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ نتیجتاً بجٹ کا خسارہ بڑھ جاتا ہے۔ اور جوں جوں یہ خسارہ بڑھتا چلا جاتا ہے بین الاقوامی مارکیٹوں سے قرض میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جس کا حتمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقامی سطح پر افراط زر کی شرح بہت بڑھ جاتی ہے اور عوام کو اور زیادہ ٹیکسوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے تا کہ حکومت کی طرف سے حاصل کردہ قرضوں کو واپس کیا جا سکے۔

ایک متبادل تعریف

شاید اب وقت آن پہنچا ہے کہ ''ملک'' کی تعریف اس طرح سے کی جائے کہ بڑے ممالک کا چھوٹے ممالک میں تقسیم ہو جانے کے عمل کو حوصلہ شکنی ہو۔ بین الاقوامی منڈیوں میں شرکت اور بین الاقوامی تنظیموں کی رکنیت کو ملک کے سائز۔ حکومتی کارکردگی اور سیاسی و معاشی ترقی سے مشروط کر دیا جانا چاہئے۔

کسی بھی ملک کی انتظامیہ کا معیار ایک ایسی چیز ہے جسے آج تک بہت کم توجہ حاصل رہی ہے ایک کو ملک محض جغرافیائی وحدت کے طور پر ہی نہیں دیکھا جانا چاہئے بلکہ اس ملک میں موجود ان اداروں کی کارکردگی پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے جو وہاں کے شہریوں کو بہتر معیار زندگی فراہم کرنے کے لئے کوشاں ہوں اور ان اداروں کے وجود کو ضروری بنانے کیلئے بین الاقوامی سطح پر اتفاق رائے کی بھی ضرورت ہے۔ ایک حکومت جو اپنے شہریوں کی حالت زار کو بہتر نہیں بنا سکتی یا انہیں ہر ضروری سہولت فراہم کرنے میں ناکام رہتی ہے اسے بین الاقوامی حمایت نہیں دی جانی چاہئے۔

مثال کے طور پر ایک فاشٹ ڈکٹیٹر جو کہ اپنے ملک میں ظلم کرنے اور اپنی جیبیں بھرنے

میں شہرت رکھتا ہو اور اسے بدقسمتی سے ملک کے اندر سے کسی حزب اختلاف کا بھی سامنا نہ ہو تو بین الاقوامی دنیا کو کم از کم یہ یقینی بنانے کی تو کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ وہ ملک میں کچھ تبدیلیاں لانے پر مجبور ہو جائے۔ اور ایسا تبھی ممکن ہے کہ اس حکومت پر کچھ بین الاقوامی پابندیاں لاگو کر دی جائیں۔ اور ان ممالک کو بھی بین الاقوامی قرضوں کے لئے نااہل قرار دے دیا جانا چاہئے جہاں معینہ مدت کے بعد انتخابات نہ ہوں۔

دنیا میں ایسے بہت سے افراد جنہیں ووٹ دینے کا حق نہیں دیا گیا اور جنہیں اپنی حکومتوں کے ہاتھوں ظلم سہنا پڑا۔ انہیں وہاں ایسی حکومت قائم کر کے آزادی دلائی جائے جو اچھی حکومت کے بین الاقوامی معیار پر پوری اترتی ہو اور اس ''اچھی حکومت'' کی بھی بین الاقوامی طور پر نگرانی کی جائے۔ اگر ہم کرنسیوں کے شرح تبادلہ کی نگرانی کر سکتے ہیں تو یقیناً کرپشن۔ بدنظمی اور ڈکٹیٹرشپ کی بھی نگرانی کی جاسکتی ہے۔

(ج) معاشیات اور معاشی پالیسی پر مضامین

(22)

تارک الوطن پاکستانی معاشیات دانوں سے مکالمہ!

امریکہ میں کچھ پاکستانی تارک الوطن معاشیات دانوں کی ایک مجلس ہوئی جس میں حسب معمول موضوع گفتگو پاکستان ہی تھا۔ اس مجلس میں بہت سے قابل معاشیات دانوں نے شرکت کی۔ چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ کچھ ہی دیر بعد معیشت کی حالت زار اور معاشی پالیسی پر اظہار خیال ہونا شروع ہوگیا۔ چونکہ میں اس تمام مجلس کے دوران موجود رہا اور ذہانت کے موتیوں کو بکھرتے دیکھتا رہا صاف ظاہر ہے اگر انہیں ریکارڈ نہ کرلیا جائے تو ان سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا لہذا میں نے اس روایتی مجلس میں ایک غیر روایتی وقائع نویس کے فرائض سنبھال لے۔

جلد ہی میں نے یہ محسوس کرلیا کہ میرے لئے کوئی معقول انتظام کئے بغیر یا کسی سیکرٹری کی مدد کے بغیر ساری بات چیت کو ریکارڈ کرنا ممکن نہ ہوگا اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی اہم گروپ میں موجود ماہرین معاشیات سے خیالات کا اظہار کی درخواست کروں ان خیالات کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کرلوں۔ مندرجہ ذیل تحریر میرے بے ہنگم نوٹس پر مبنی ہے جو اس شام میں نے لکھ لئے تھے۔ (میں ان تمام شرکاء محفل سے معذرت خواہ ہوں جنہوں نے اپنے نام ظاہر نہ کرنا پسند کئے ممکن ہے میں ان کے نظریات و خیالات سے پوری طرح انصاف نہ کر سکا ہوں اور قارئین سے میں معذرت کرتا ہوں کیونکہ اس شام حاصل ہونے والی گفتگو جامع انداز میں ان تک نہیں پہنچ پائی)

س: آپ پاکستان کی معیشت کی عمومی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے اسے کونسا درجہ دینگے! (یہ بتانا ضروری ہے کہ ہر سوال پر بہت گرما گرم بحث ہوئی اور ہر مرحلے پر میں نے کوشش کی کہ بحث کا خلاصہ آپ تک پہنچا سکوں ویسے تو یہ دانت کھینچنے کے مترادف ہے لیکن یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ جوابات بنیادی طور پر اس مجلس میں ہونے والی گفتگو کے خلاصے سے تیار کئے گئے ہیں)۔

ج: معیشت کی حالیہ کارکردگی پر عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا گیا خاص طور پر معاشی نمو 'Growth' اور افراط زر کے حوالے سے معیشت مستحکم رہی۔ لیکن کرنٹ اکاونٹ اور مالیاتی خسارہ ضرورت سے زیادہ بتایا گیا اور سرمایہ محفوظ کی مقدار بھی اطمینان بخش نہ تھی۔ اس بحث کے دوران دو

دلچسپ انداز ہائے فکر سامنے آئے پہلے انداز فکر کے مطابق عام تاثر یہ تھا کہ ملکی معیشت کی اطمینان بخش کارکردگی کی توجیح نہیں کی جاسکتی کیونکہ دی گئی بچتوں اور سرمایہ کاری کی شرحیں تو پاکستان ہی کی جیسی معیشت رکھنے والے ممالک سے کم ہیں جبکہ Growth زیادہ ہے دوسری طرف افراط زر بھی ان ممالک کی نسبت زیادہ تھا جن کا مالیاتی خسارہ یا تو پاکستان جتنا تھا یا اس سے کم تھا۔

دوسرے انداز فکر کے مطابق حکومتی اعداد وشمار نا قابل اعتبار ہے۔ انفرادی مشاہدے کو بنیاد بنا کر اس گروپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ معیشت کی اصل Growth کی شرح کہیں زیادہ ہوسکتی تھی جتنی کی بتائی گئی ہے۔ گروپ میں یہ احساس بھی پایا گیا کہ حالیہ برسوں میں کالی معیشت میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور اگر کالی معیشت کے اعداد وشمار کو سرکاری اعداد وشمار سے ملا دیا جائے تو Growth کی شرح اس شرح سے بہت زیادہ ہوگی جو کہ بتائی گئی ہے۔ اس بیان کی تصدیق کیلئے ایک قصوں پر مبنی شہادت بھی پیش کی گئی جو کہ ایک صاحب کے پاکستان میں قیام کے دوران مشاہدے میں آئی تھی۔ افراط زر سے متعلق اعداد وشمار کو بھی بہت کم افراد نے صحیح تسلیم کیا یہ محسوس کیا گیا کہ اگر صحیح طریقہ اپنایا جائے تو پتہ چلے گا کہ آٹھوئیں دہائی کے دوران افراط زر دوہرے ہندسے میں ہے جبکہ حکومت کا اصرار ہے کہ افراط زر دس سے نیچے ہی رہا ہے۔

س: اس امید افزاء تصویر کشی کے باعث لگتا ہے کہ پاکستان کی کارکردگی بہت اچھی رہی ہے اور اسے کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیا کوئی ایسے بھی معاشی پہلو ہیں جو پریشانی کا سبب بن سکتے ہیں۔

ج: اس سوال کے جواب میں اجتماعی نظریہ یہ تھا کہ حالیہ تجربے کے باوجود Growth میں اضافہ نہیں ہوسکا۔ گھریلو وسائل کا استعمال (Domestic resource mobilization) بہت محدود رہا جس کی وجہ سے بیرونی سرمایہ (External Financing) پر انحصار بہت بڑھ گیا۔ حالیہ جغرافیائی وسیاسی حالات میں تبدیلی کے باعث کافی Financing Concessional مہیا ہوگئی ہے لیکن پوری دنیا میں اس سرمایہ کاری کی مانگ میں بھی اضافہ ہوگیا ہے اور آہنی پردے کے ہٹ جانے کے باعث بیرونی سرمایہ حاصل کرنا بہت مشکل ہو جائے گا مزید یہ کہ اس طرح کی سرمایہ کاری بہت مہنگی ہو جائے گی بین الاقوامی معیشت کی اس قسم کی پیشرفت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کمیونزم کے بعد اپنی بقاء کیلئے اپنی پیداوار کو تیزی سے بڑھانے اور مقابلہ کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرنا اشد ضروری ہوگیا ہے۔ پاکستان اپنی مقامی سیاست کے مسائل میں اس طرح الجھا ہوا ہے

کہ معاشی امکانات کچھ زیادہ روشن نظر نہیں آ رہے۔

س: آپ حکومت کو کونسے عملی اقدامات تجویز کریں گے؟

ج: اس بات پر عمومی اتفاق رائے تھا کہ موجود مسائل سے نپٹنے کے لئے اور پاکستان کو مقابلہ کرنے کی صلاحیت فراہم کرنے کیلئے سب سے اہم کام حکومت کے کردار اور اس کے حجم کو دوبارہ سے واضح کرنا ہوگا۔ اس وقت حکومت حد سے زیادہ بڑی ہے اور ہر چیز میں مداخلت کرنے کا رجحان رکھتی ہے اس لئے کوئی بھی کام صحیح طور پر سرانجام نہیں دے پاتی۔ علاوہ ازیں عوام کو بھی یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اس حد سے زیادہ وسیع اور نااہل حکومت کی ضرورت نہیں اور اس کا خرچ وہی برداشت کر رہے ہیں اور انہی کو برداشت کرنا پڑے گا۔

س: حکومت کے کردار کو نئی جہت دینے کیلئے آپ کے پاس کیا تجاویز ہیں؟

ج: حکومت کو واضح طور پر بلکہ آئینی فرمان کے ذریعے۔ یہ ممکن بنا دینا چاہئے کہ وہ آئندہ اشیاء کی پیدائش سے اجتناب برتے۔ یہ ایسا کام ہے جسے حکومت ماضی میں مناسب طور سے سرانجام نہیں دے سکی۔ یہ کام دراصل نجی شعبے کا ہے اور وہی اسے بہتر انداز میں کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں پہلا قدم جو بہت ضروری ہے وہ تمام سرکاری کارپوریشنوں اور فیکٹریوں وغیرہ کی نجکاری ہے۔ حکومت کی نجکاری کی موجودہ پالیسی کو ان حضرات نے بہت سراہا اور امید ظاہر کی کہ اس پالیسی کو برقرار رکھا جائے گا۔

لیکن حکومت نے بہت سے بیمار محکموں کارپوریشنوں اور اداروں کو ابھی تک بند نہیں کیا۔ سیاسی نقطہ نظر سے اگرچہ یہ بہت مشکل کام ہے لیکن امید ہے کہ حکومت اس کام کو اپنے انجام تک پہنچائے گی۔ ابھی تک تو منافع بخش کارپوریشنیں یا وہ ادارے جن کے اثاثوں کی قیمت بہت زیادہ تھی نجی شعبے کو فروخت کئے گئے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ نااہلی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب نقصان میں رہنے والے اداروں اور غیر ضروری محکموں کو بند کر دیا جائے وگرنہ حکومتی اخراجات بڑھتے ہی جائیں گے اور انہیں پورا کرنے کیلئے ٹیکس دہندگان پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھانا پڑے گا۔

حکومت کے کردار کو نئی جہت عطا کرنے (محدود کرنے) کیلئے ضروری ہے کہ (الف) نجی شعبے کو جدید انفراسٹرکچر مہیا کیا جائے (ب) ضوابط کی ٹھیک طرح سے وضاحت اور ان کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے اور مقابلے والی مارکیٹ (Competitive Market) کے لئے قوانین وضع

کئے جائیں حکومت کو ان کاموں کو سرانجام دینے کیلئے ادارے قائم کرنے چاہیں جن میں قابلیت اور اہلیت پر زور دیا جانا چاہئے۔

س: تب حکومتی قواعد وضوابط کا کیا کردار ہوگا؟

ج: حکومت کے ضوابط اور ان کی رپورٹنگ کو ہر وقت احتیاط کے ساتھ پیداوار میں اضافے پر زور دیتے ہوئے جانچا جائے گا۔ ضوابط کا کام صرف یہ ہوگا کہ اشیاء کے مقابلے کی حدود کو معین کیا جائے نہ کہ مقابلے پر قدغن لگا دی جائے۔ مزید یہ کہ ان حدود کو سختی سے نافذ کیا جائے اور نظام میں اس قدر لچک ہونی چاہئے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح کرتا رہے۔ ہمارا نظام بدقسمتی سے اس لچک سے محروم رہا ہے لیکن یہ مسئلہ فی الحال ہمارے سے متعلق نہیں۔

لائسنس دینے اور راشننگ کی موجودہ ریت سے وسائل کو غلط انداز میں مختص کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور درمیانی زمانے (Gestation lag) کی سہولت فراہم کرنا بھی ایک فضول سا عمل ہے جس کی کوئی افادیت نہیں ایک بہت دلچسپ تجربہ کرنے کی تجویز بھی مجلس میں زیرغور آئی کہ اگر ایک منصوبہ ایک مخصوص وقت میں پاکستان کیلئے تجویز کیا جائے اور اس جیسا منصوبہ اتنے ہی وقت میں امریکہ کیلئے تجویز کیا جائے اور دیکھا جائے تو تقریباً سبھی کا خیال تھا کہ جتنے چند امریکہ میں اس منصوبے کی تکمیل میں صرف ہونگے اتنے ہی سال پاکستان میں صرف ہونے کا امکان ہے۔ وقت میں اتنے زیادہ فرق کی وجہ یہی بیان کی گئی کہ پاکستان میں قواعد وضوابط کی اتنی بھرمار ہے کہ منصوبے بہت ہی تاخیر سے تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستان میں ارباب اقتدار کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ درمیانی زمانہ (Gestation lag) نہ صرف آجر کیلئے نقصان کا باعث ہوتا ہے بلکہ ملک کیلئے بھی نقصان ہی کا باعث بنتا ہے۔

قواعد کو ختم کرنے کی راہ میں جو مشکلات حائل ہیں ان پر بھی سب کا اتفاق تھا قواعد کی زیادتی کسی حادثے کی پیداوار ہرگز نہیں بلکہ طاقت رکھنے والے بااثر افراد انہی قواعد سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی لوگ حکومت کی طرف سے کی جانے والی قانون سازی سے جنم لینے والے (Rents) سے 'لائسنسوں' گرانٹوں یا آسانی سے حاصل ہو جانے والے قرضوں کی وجہ سے آرام و سکون اور پرآسائش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سرگرمیاں براہ راست اشیاء کی پیدائش کا سبب نہیں بنتی چنانچہ ان کیلئے لوگوں پر مزید ٹیکس لگانا پڑتا ہے۔ Rent seeking یعنی جائیداد کو کرائے پر اٹھا کر پیسے بٹورنا معیشت کیلئے بہت نقصان دہ ہے

اس طرح Rent seeking آجروں کو بجائے پیداواری عمل میں شریک ہو کر منافع کمانے کے حکومتی رابطوں کے ذریعے سے تیزی اور ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کی راہ پر لگا دیتی ہے اب Rent seekers اس قدر مضبوط ہو گئے ہیں کہ ایسے ہر قدم کی راہ میں وہ رکاوٹ ڈالیں گے جو تبدیلی لانے کیلئے اٹھے گا خاص طور پر جو تبدیلی انہیں فوائد سے محروم کرے گی۔

س: حیرت کی بات یہ ہے کہ اب تک زری اور مالیاتی پالیسیوں پر کوئی بات نہیں ہوئی۔

ج: حکومت کی پالیسیوں کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد لوگوں کو مواقع فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اسے یہ مقاصد صرف بالواسطہ طور پر ہی پورے کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور وہ اس طرح کہ پالیسیوں کی فضا میں استحکام اور اعتماد پیدا کرے تاکہ نجی شعبے کو سہولت ہو اور اس کی حوصلہ افزائی بھی ہو۔ اس ضمن میں حکومت کا اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ وہ قیمت اور شرح تبادلہ میں استحکام رکھے اور اندرونی و بیرونی قرضوں کی زیادتی سے پرہیز کرے ہم کہہ سکتے ہیں حکومت کے لئے ایک مستحکم زری و مالیاتی پالیسی کو مرتب کرنا بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

بہت زیادہ مالیاتی خساروں کو جو پاکستان میں معمول بن گئے ہیں زیادہ دیر تک برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا اور یہاں بجٹ کے ساختیاتی کڑے پن نے جلد از جلد قرض خواہی میں کمی کے رجحان کو اور مشکل بنا دیا ہے۔ اخراجات تین مدوں پر مشتمل ہوتے ہیں یعنی دفاع' قرضوں کی واپسی اوور انتظامیہ اور تقریباً تمام اخراجات انہی شعبوں ہی پر ہو جاتے ہیں اس لئے قرضوں میں کمی کرنا۔ کوئی آسان کام نہیں۔

ان حالات میں خطرہ یہ ہو جاتا ہے کہ حکومت مجبور ہو کر اپنی بجٹ کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے مزید نوٹ نہ چھاپنا شروع کر دیئے۔ اور زیادہ نوٹ چھاپنے کا مطلب افراط زر کو شدید تر کر دینا ہے۔ اس سے ملک کی بین الاقوامی سطح پر مقابلے کی صلاحیت متاثر ہو گی نتیجتاً کرنسی کی قدر کو کم کرنا پڑے گا۔ جب افراط زر اور روپے کی قدر میں کمی کی علامت ظاہر ہونگی تو سرمایہ باہر منتقل ہونا شروع ہو جائے گا جس سے ملک کے سرمایہ محفوظ (Reserve) میں کمی واقع ہو جائے گی اور پھر معیشت کیلئے ٹیکسوں کی بنیاد کی جو ضرورت ہوتی ہے وہ بھی نہ رہے گی۔ یہ چکر جو پیسے کی زیادتی سے شروع ہو کر افراط زر' روپے کی قدر میں کمی' سرمایہ محفوظ میں کمی اور خسارے میں زیادتی بالآخر آکر اونچے درجے کے افراط زر پر منتج ہوتا ہے مجلس میں لاطینی امریکہ کے کئی ممالک کے حوالے دیئے گئے۔ جہاں حالیہ برسوں میں ایسی صورتحال عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔

س: جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ مالیاتی خسارہ خطرناک ہے اور اس خسارے کو جلد از جلد کم سے کم تر سطح تک لے آنا چاہئے۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ مزید ٹیکس لگائے جائیں؟

ج: پاکستان کے شہریوں کو یہ واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ حکومت کا قرضہ صرف ان کے ٹیکسوں ہی سے ادا ہوگا۔ ٹیکس یا تو براہ راست وصول کیا جاتا ہے یا پھر افراط زر کے ذریعے بالواسطہ طور پر! افراط زر اس وقت جنم لیتا ہے جب قرضوں کو ادا کرنے کیلئے نوٹ چھاپے جاتے ہیں ہر دو صورتوں میں نقصان عوام ہی کا ہوتا ہے۔

لیکن حکومتی اخراجات میں کمی کر کے جہاں کہیں بھی ممکن ہو تو بچتوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے جس سے ٹیکسوں کے بوجھ میں زیادتی سے بچا جا سکتا ہے۔ عمومی مشاہدے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حکومت وسائل کے ضیاع اور غیر ضروری اخراجات سے اکثر پرہیز نہیں کرتی اگر حکومت میں قابلیت کے معیار کو بڑھا دیا جائے ممکن ہے اس سے ایسا فائدہ ہو کہ ٹیکسوں کا بوجھ کم ہو جائے۔ مزید یہ کہ ٹیکسوں کے نظام میں اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔ لوگوں کو اس بات پر قائل کیا جانا چاہئے کہ وہ ٹیکس ادا کریں اور ساتھ ہی ٹیکسوں کی وصولی کو بھی بہتر بنایا جانا چاہئے۔ صحیح خطوط پر اگر ٹیکسوں میں اصلاحات متعارف کرائی جائیں تو یقیناً حکومت کی وصولیوں میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ حکومت اگر وسائل کے ضیاع پر کنٹرول کر لے اور ٹیکسوں کی وصولیوں کو بہتر بنا لیا جائے تو ٹیکسوں کے بوجھ سے بچا جا سکتا ہے۔

(اب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور حاضرین مجلس بیقرار سے ہونے لگے۔ گفتگو کے دوران بہت سے اہم موضوعات پر بات ہوئی۔ جو بہت دلچسپ اور اہمیت کے حامل تھے اور ہر ایک پر بہت توجہ دینے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ اس شام ان مسائل میں سے کسی ایک سے بھی انصاف نہ کیا جا سکا چنانچہ ایک تجویز یہ رکھی گئی کہ پھر کبھی ان موضوعات کو پھر سے زیر بحث لایا جائے گا۔ شاید ان میں سے کسی مسئلہ پر سنجیدگی اور گہرائی سے غور و غوض کیا جا سکے۔ لیکن میں نے اصرار کیا کہ ایک آخری سوال کا جواب ضرور دیا جائے۔)

س: کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ اس کے باوجود کہ ملک میں خوشحالی کی فضا دیکھنے میں آئی ہے لیکن پاکستان کے افق پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ معاشی بحران سے نکلنے اور اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کیلئے کئی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے لیکن ان اقدامات کیلئے کئی مشکل فیصلے کرنا

ہونگے۔کیا ایسے فیصلے کرنے کی کوئی امید ہے؟ یا کیا آپ حضرات کی تجاویز پر حکومت کے غور کرنے کا کوئی امکان ہے؟

ج: تقریباً ہر ایک نے اس کا جواب نفی میں دیا۔مزید برآں انہوں نے کہا کہ سوال یہ نہیں کہ حکومت کون کر رہا ہے۔سردست معلوم یہ ہوتا ہے کہ (الف) ملک میں کوئی بحث مباحثہ نہیں ہو رہا جو معلوماتی ہو (ب) کسی مضبوط اور سمجھ بوجھ والے سیاستدان کے ظہور کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔ سیاست تو سماجی بھلائی کا خیال کئے بغیر ذاتی منافع کمانے کا ایک کاروباری ذریعہ بن کے رہ گئی ہے۔مزید یہ کہ اقتدار میں رہنے کے لئے ذاتی مفادات کو پورا کرنا اور دوسروں کو نوازنا ضروری ہو جاتا ہے۔ایسے مفادات کو عزیز جاننے والی لیڈرشپ سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس طرح کے مشکل فیصلے کریں اور مفاد پرستوں کے منافعوں کو کم کردیں۔

مشکل فیصلے یا اصلاحات کرنا اور انہیں نافذ کرنا یہ ایسے کام ہیں جن سے طاقتور گروہ متاثر ہونگے۔اور ان مشکل فیصلوں کی زد میں پالیسی ساز، سیاستدان، بیوروکریٹ اور ملٹری کے لیڈر بھی آئیں گے اور یہ سب اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کیلئے سب کچھ کرگزرنے پر تیار ہو جائیں گے۔اور جو لیڈرشپ اس وقت پاکستان میں ہے وہ ایسی نہیں کہ اس طرح کے سخت فیصلے کرگزرے۔

(23)

ایک کاروباری ماہر کا نقطہ نظر

میرا دوست ملک فرید محمد اور میں حیدرآباد کے ایک ہی سکول میں جاتے تھے بعد میں کراچی کے ایک ہی کالج میں بھی جاتے رہے۔صرف ہم جب امریکہ سدھارے تو ہماری راہیں جدا ہوئیں۔فرید نے ایک معروف بزنس سکول سے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی اور بہت بڑی کاروباری فرم کی مشاورت کا فرض سنبھالا۔اسے اس فرم کے لئے کام کرتے ہوئے 15 برس ہو گئے ہیں اور اب وہ بہت بڑے عہدے تک جا پہنچا ہے۔اب اسے کاروباری مشاورت کا بہت وسیع تجربہ حاصل ہو چکا ہے نہ صرف مقامی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی۔

فرید نے مجھے چند معروف معاشیات دانوں کے خیالات کو ریکارڈ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے دیکھا تو اس نے بھی اپنے خیالات سے مجھے آگاہ کیا جو انتہائی دلچسپ تھے۔اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ فرید جیسے لوگوں کے پاس بھی اس مضمون سے متعلق کہنے کو بہت کچھ ہے جو ہمارے دلوں کے اتنا قریب ہے۔چنانچہ میں نے ارادہ یہ کیا کہ اس دفعہ پھر ایک مباحثے کا اہتمام کیا جائے لیکن اس دفعہ کاروباری پیشہ ور ماہرین (Business Professionals) کے ساتھ۔

چنانچہ ہم نے پاکستانیوں کے ایک گروپ کو اکٹھا کیا جس میں (الف) وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے بڑی بڑی کارپوریشنوں کے ساتھ بڑی کامیابی کے ساتھ کام کیا تھا (ب) وہ لوگ جو بہت کامیاب آجر تھے (ج) وہ امریکی کاروباری لوگ جن کو ترقی پذیر ممالک کا کچھ نہ کچھ تجربہ تھا۔

ایک مرتبہ پھر میں شرکا اور قارئین سے معذرت خواہ ہوں کیونکہ جو مسائل تب زیر گفتگو رہے ان سے میں پوری طرح انصاف نہیں کر سکا۔دراصل غیر روایتی قسم کی تحقیق کرتے وقت اس طرح کی مشکلات فرد کو درپیش ہوتی ہی ہیں۔لیکن اس پر ہمارا اتفاق ہے کہ بیشک میری یہ کاوش نامکمل ہی صحیح لیکن یہ بہت مفید ان معنوں میں ہے کیونکہ اس سے چند ایسے خیالات کو جمع کر لیا گیا جو وگرنہ منظر عام پر نہ آ سکتے۔میں یہ بھی کہتا چلوں کہ میرے خیال میں اتنے قابل اور اہل گروپ کے خیالات

ان تمام لوگوں کیلئے باعث دلچسپی ہونگے جو پاکستان کے امور سے کسی نہ کسی طرح متعلق ہیں نہ صرف وہاں کے عوام بلکہ پالیسی ساز بھی۔ اس معذرت کے ساتھ آیئے اس مباحثہ کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

س: آپ کے خیال میں آج کل پاکستان میں کاروباری حضرات کو کونسے بنیادی مسائل کا سامنا ہے؟

ج: میرے خیال میں کاروبار اور کاروباری طبقے کے درمیان فرق کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ برسہا برس سے حکومت نے جو اپنا سرپرستی کا نظام قائم کیا ہوا ہے اس سے کئی عیار بزنس مین تو وجود میں آ گئے ہیں لیکن اس سے کوئی طویل المعیاد کاروباری فضا کے قیام میں مدد نہیں مل سکی۔ آجریت (Entrepreneurship) یا پیداواری صلاحیت میں اضافے کا باعث بننے والے کاروبار کئی طرح سے حکومت کی وسعت کے نیچے دب سے گئے ہیں۔ بنا کام کئے منافع کمانے والے (Rent Seekers) یا وہ افراد جنہیں اس نظام سے فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ اتنے بڑے حجم والی حکومت کے ساتھ ان کے روابط قائم ہیں اور جو انہیں نوازتی بھی ہے انہیں تو یقیناً بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ بنا کام کئے منافع کمانے والے (Rent Seekers) پیسہ کمانے کے متبادل راستے یہ سوچے بغیر تلاش کرتے رہتے ہیں کہ ان سے ملکی پیداوار میں بھی کسی قسم کا اضافہ ہوگا یا نہیں۔ اس لئے ہر فرد پلاٹوں یا لائسنسوں کے حصول کیلئے سرگرداں ہے کیونکہ ان ذرائع سے آسانی سے پیسہ بنایا جا سکتا ہے۔ وہ آجر یا بزنس مین جو یہاں کوئی ایسا کاروبار قائم کرنا چاہتا ہے جس سے ملکی ترقی میں مدد مل سکے اور یہاں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو وہ مایوس ہو کر اپنے ہاتھ باندھ لیتے ہیں کیونکہ ملکی بیوروکریٹس نے کچھ بھی کرنے کو تقریباً ناممکن بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس سوال کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ نجی شعبے کی نشوونما کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہر طرف سے در آنے والی حکومت ہے جو بنا کام کئے منافع کمانے کے مواقع فراہم کر دیتی ہے لیکن طویل المعیاد سرمایہ کاری کے منصوبوں جن سے ملکی فائدہ ہو سکتا ہو انہیں پس پشت ڈال دیتی ہے۔

س: آپ کی دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک کے لئے نجی شعبے کا کردار بہت اہم ہے کیا اس بات پر پاکستان میں اتفاق رائے موجود ہے؟

ج: یقیناً نہیں! حتی کہ آج بھی اگر یہ الفاظ ''نجی شعبہ'' ادا کئے جائیں تو عام با اثر حلقوں میں فحاشی تصور ہونگے۔ غالباً ایسی سوچ ہمیں نوآبادیاتی ورثے کے طور پر ملی ہے۔ کیونکہ تب ریاست کا

ایسا ہی تصور تھا کہ وہی لوگوں کے لئے بھلائی کے کام سرانجام دے سکتی ہے۔ معاشیات دان۔ بیوروکریٹس اور پالیسی ساز اس مفروضے پر بہت تیزی سے جا پہنچتے ہیں کہ ریاست کو معیشت میں بہت بڑا اور مثبت کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ معاشیات داں جن میں سے اکثر بیسویں صدی کے وسط میں رائج انگلش لیبر پارٹی کے فلسفہ سے متاثر تھے۔ آمدنی کی دوبارہ تقسیم' زرعی اصلاحات' نیشنلائزیشن' سرکاری شعبے کے کردار میں اضافہ اور عمل پیدائش میں حکومت کے اضافی کردار تجویز کر رہے تھے۔ یہ مقاصد تو بڑے نیک اور قابل ستائش تھے اور یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان معاشیات دانوں کی نیتوں میں فتور تھا انہیں حقیقتاً غریبوں کی فکر تھی اور ان کا دل غرباء کے لئے خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ان کی اسی سوچ کے طفیل حکومت پاکستان انہیں ملازمتوں اور کنٹریکٹس سے نوازتی تھی۔

پاکستان کے مشہور معاشیات دان بڑی اور مہربان حکومت ہی کو لوگوں کی نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے نظریئے کو صحیح ثابت کرنے کیلئے بہت سی دلیلیں دیتے ہیں۔ ان کے مطابق غریب اور ان پڑھ عوام اپنے طور پر اپنے مسائل کو حل نہیں کر سکتے چنانچہ حکومت کو ان کی مدد کیلئے آگے آنا چاہئے حکومت کا یہ فرض ہے کہ غریبوں کے لئے خوراک' کپڑے' تعلیم اور صحت کا خیال رکھے۔ ہمارے ہاں امیر بہت زیادہ امیر ہے چنانچہ انہیں اصراف کی لت پڑ چکی ہے غریبوں کو کسی حد تک امیروں کی سطح تک پہنچانے کیلئے حکومت کا دخل ناگزیر ہے۔ ان کے خیال میں پرائیویٹ سیکٹر نااہل اور لالچی ہے اور ہماری معاشی ترقی سے اسے نہ تو کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی اس کے لئے وہ کچھ کرنے کے قابل ہے۔

س: کیا آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے ملک میں معاشی ترقی کیلئے نجی شعبے کا کردار سرکاری شعبے سے زیادہ فعال رہا ہے؟

ج: اس سوال کو اگر اس طرح سے کیا جائے کہ کیا حکومت نے جو کچھ کرنے کا وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا یا کیا حکومت وہ کچھ کر سکتی ہے جو پنڈتوں کے خیال میں اسے کرنا چاہئے۔ ان دونوں سوالوں کا واضح سا جواب تو یہی ہے کہ ''نہیں'' آپ خود دیکھیں کہ قومیائے گئے بینکوں کا حکومت نے کیا حشر کیا ہے انہیں صرف امیروں کو تحفے دینے کیلئے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ بینک جن کا پہلے نجی شعبہ بہت بہتر انداز میں انتظام سنبھالتا تھا۔ اب وہ مکمل دیوالیہ پن کی زد میں آ چکے ہیں اور بینکوں کو ہونے والے ان نقصانات کو غریب عوام ہی کو پورا کرنا پڑے گا۔ اور (Rent Seekers) بنا کام کئے

منافع کمانے والے جنہیں اس بینکوں کے نظام سے گرانٹیں ملتی ہیں وہ نوسر بازی کے دوسرے طریقوں سے لوگوں کو دوسری راہوں پر لگا دیں گے۔ بڑے بڑے بالائی اخراجات' ضرورت سے زیادہ لوگوں کی بھرتی اور نااہل انتظامیہ کے باعث یہ صنعتیں اور ادارے اپنی پوری صلاحیتوں کو کام میں لانے کے قابل نہیں رہتے۔ اس کی عمدہ مثال پی آئی اے کی ہے جسے بہتر انتظامیہ اور بالائی اخراجات پر کنٹرول کر کے منافع آور ادارہ بنایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر جب اسے محفوظ منڈی اور وفادار گاہک بڑی تعداد میں میسر ہیں۔

اس کے برعکس اگر نجی شعبے کا جائزہ لیا جائے تو ٹیکسٹائل کے شعبے میں حالیہ برسوں کے دوران بہت منافع ہوا اس شعبے میں سرمایہ کاری بھی بہت بڑھی اور اب اس کی مصنوعات برآمد بھی ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ علاوہ ازیں ٹیکسٹائل کا شعبہ وہ واحد شعبہ نہیں جس نے کامیابی حاصل کی بلکہ تعلیم کے میدان میں بھی نجی شعبے نے قومی معیشت کی بہت خدمت کی ہے۔ تیس سال سے بھی زیادہ عرصے تک ''عالموں'' کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے حکومت نے تعلیم کی تمام کی تمام ذمہ داری سنبھالے رکھی۔ اس کے باوجود کہ حکومت اور اس کے ''رہائشی معاشیات دانوں اور دانشوروں'' نے بہت سے منصوبے تیار کئے اور بہت سا پیسہ بھی برباد کیا۔ لیکن اس سے تعلیم کے محکمے میں بیوروکریسی کے حجم میں تو اضافہ ہوا لیکن نہ تو تعلیم کا معیار بڑھا اور نہ ہی تعلیم کے دائرے میں وسعت آئی۔ ستر کی دہائی کے آخری ایام میں نجی شعبے میں سکول کھولنے کی اجازت دے دی گئی کچھ ہی عرصے میں ہر شہری مرکز میں بہت سے سکول قائم ہوتے ہوئے نظر آئے۔ اگر یہ ان نئے قائم ہونے والے سکولوں میں فرق تو بہت تھا لیکن مجموعی طور پر ان پرائیویٹ سکولوں نے ملک میں تعلیم کے معیار کو بلند کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اور تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی اضافہ کرنے میں مدد دی۔

س: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نجی شعبے کی ناکامیوں کو نظر انداز کر رہے ہیں مثال کے طور پر نجی شعبے میں قائم ہونے والی فنانس کمپنیاں ہماری تاریخ میں دو دفعہ ناکامی کا شکار ہو چکی ہیں۔

ج: بے شک پرائیویٹ کمپنیوں کی ناکامی کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جب پرائیویٹ کمپنیاں ناکام ہوتی ہیں تو عوام کو نقصان نہیں ہوتا اور اگر حکومت کے مالیاتی ادارے ناکام ہو جائیں تو گو کہ عوام کو نقصان کا صحیح اندازہ تو نہیں ہو پاتا لیکن اس نقصان کو انہی ہی کے ٹیکسوں سے پورا کیا جاتا ہے۔ مزید برآں سرکاری اداروں میں ہونے والے نقصانات لمبے عرصے تک پورے نہیں ہوتے جبکہ پرائیویٹ اداروں میں ہونے والا نقصان جلد ہی پورا کر لیا جاتا ہے کیونکہ رقم

مالک کی جیب سے وصول کر لی جاتی ہے۔ چنانچہ منافع کمانے والی اور اہلیت رکھنے والی پرائیویٹ فرم جو معیشت کی بہتری کیلئے بھی کردار ادا کر رہی ہو اور لوگوں کے لئے روزگار بھی مہیا کر رہی ہو وہ قائم رہتی ہے جبکہ نااہل حکومتی فرم جو بجٹ کا پیسہ ہڑپ کرتی جا رہی ہو اس سے جان چھڑانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

نجی شعبے کی ناکامی کو ثابت کرنے کیلئے فنانس کمپنیوں کی مثال بہت اکثر دی جاتی ہے۔ یہ مثال وہ لوگ دیتے ہیں جو اسے ناکام دیکھنا چاہتے ہیں اور جنہیں حکومت کے قواعد وضوابط سے فائدہ ہو رہا ہوتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس واقعے کی تفصیل جاننے کیلئے کوئی جامع سٹڈی نہیں کی گئی۔ یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ ہر صنعت میں چند کمپنیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں صحیح طور پر نہیں چلایا جاتا اس لئے وہ زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ان سب کمپنیوں میں سے کوئی بھی اپنے کاروبار کو صحیح طور پر چلانے کا ارادہ نہ رکھتی ہو۔ آخر روتھس چائلڈ اور مورگنز نے بھی اسی طرح اپنے اداروں کو قائم کیا تھا اور اب وہ اتنے عرصے سے قائم ہیں کہ اتنا عرصہ کئی ممالک کے قیام کو بھی نہیں ہوا۔ جہاں تک فنانس کمپنیوں کی ناکامی کا سوال ہے حکومت کو چاہئے تھا کہ کچھ قواعد وضوابط بناتی اور ان کمپنیوں کے اثاثوں اور اکاؤنٹوں کی جانچ پڑتال کا بندوبست کیا جاتا بعد ازاں عوام کے سامنے ان کمپنیوں کی صحیح کارکردگی کو پیش کیا جاتا۔ بجائے اس کے حکومت نے تمام کمپنیوں کے بارے میں عوام کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے شروع کر دیئے جس سے تمام فنانس کمپنیاں جن میں چند بہت اچھی اور کامیاب بھی تھیں لوگوں کا اعتماد کھو بیٹھیں اور ہم یہ تو جانتے ہی ہیں کہ فنانس کمپنیاں کھاتے داروں کے اعتماد کے سہارے چل سکتیں ہیں حتی کہ بہت مشہور اور بڑا بینک بھی اگر کھاتے داروں کا اعتماد کھو دے تو وہ برباد ہو جاتا ہے۔ ایسا کر کے حکومت نے تمام آجروں کے کاروباروں کو ٹھپ کر دیا اور پھر اس نے وہی کیا جس میں اسے بے پناہ مہارت حاصل ہے یعنی لائسنسوں کا اجراء۔ ایسے بڑے کاروباری ادارے جو ہمیشہ سے حکومت کے لائسنسوں ہی کے بل بوتے پر پلتے بڑھتے رہے ہیں یا اپنے سیاسی حلیفوں کو ان لائسنسوں سے نوازا گیا۔ پچھلے تین چار برسوں کے دوران امیروں اور با اثر لوگوں کی طرف سے یہ لائسنس حاصل کرنے کے لئے دوڑ لگی ہوئی ہے۔ قومی مالیاتی شعبے کی ترقی پر بہت قیمتی وقت ضائع کیا گیا ہے۔ پہلے تو لائسنس جاری کر دیئے جاتے ہیں اور اگر لائسنس لینے والا اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرے تو وہ لائسنس منسوخ کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہم سب پر واضح ہو جانی چاہئے کہ صاحب اقتدار کا ایسا کرنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ

اس سے ملکی ترقی ہو بلکہ وہ محض فوائد پہنچا کر اپنے مفادات کی تکمیل کا سامان کرتے ہیں۔اوراب تو یہ لائسنس فروخت بھی ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

س: نجی اور سرکاری شعبوں کے آپ کے خیال میں کیا فرائض ہیں اور ان کا کیا کردار ہونا چاہئے؟

ج: نجی شعبہ خلا میں تو اپنا کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ وہ قوانین جن کے تحت نجی شعبہ کام کر سکتا ہے اور اسے کرنا بھی چاہئے (الف) انہیں بہت واضح ہونا چاہئے اور ان کی سادگی سے تشریح کی جانی چاہئے اور (ب) انہیں جمہوری اصولوں کے مطابق اور انصاف کے ساتھ نافذ کیا جانا چاہئے حکومت کا بنیادی فرض یہی ہے کہ وہ ایسے قوانین بنائے اور ان قوانین میں مستقل طور پر ارتقاء کرتی رہے۔ایسا کرتے وقت اس کے ذہن میں صرف ایک ہی چیز ہونی چاہئے کہ وہ نجی شعبہ میں قابلیت کو کیسے بڑھا سکتی ہے تمام قوانین اسے مدنظر رکھتے ہوئے بنائے جانے چاہیں۔قوانین بناتے وقت حکومت کو ان کی سادہ نوعیت اور شفاف ماہیت پر سب سے زیادہ دھیان دینا چاہئے۔اسے نجی شعبہ کو یہ ہدایت دینے کی ضرورت نہیں کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کس قسم کا کاروبار کرنا چاہئے۔ بلکہ اسے ایسا قانونی ڈھانچہ تشکیل دینے پر توجہ صرف کرنی چاہئے جس سے نجی شعبہ میں قائم اداروں کی جوابدہی ممکن ہو اور جوابدہی نہ صرف نجی شعبے کی ہو بلکہ سرکاری شعبہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہونا چاہئے۔ایسا کرنے سے ریکارڈ کو صحیح طور پر محفوظ رکھا جائے گا۔عوام کو ہر سرگرمی سے مطلع کیا جائے گا اور فریقین میں جو بھی معاہدے طے پائے ہونگے ان کا ہر سطح پر نفاذ یقینی بنایا جا سکے گا۔جلد اور سستا انصاف ایسے نظام کا بنیادی عنصر ہوگا۔مثال کے طور پر شیئر ہولڈر غفلت برتنے والے منتظم کو عدالت میں طلب کر سکیں گے بجائے اس کے کہ وہ مقامی انتظامیہ کو رشوت دینے پر مجبور ہو جائیں۔ایسے قوانین کو اگر حکومت صحیح طرح سے نافذ کر دے گی تو اس میں اسی مصروفیت اس قدر بڑھ جائے گی کہ اسے دوسرے مسائل میں دخل دینے کا وقت ہی نہیں ملے گا جن مسائل میں ویسے بھی اسے دخل نہیں دینا چاہئے لیکن اس شعبے میں سیاسی سرپرستی ممکن نہ ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے بہت سے لوگوں کو تکلیف بھی ہو۔

س: اس گفتگو میں ''وسائل کی کمی'' کہ جس کا ہمارے ممالک کو سامنا ہے' کا ابھی تک کوئی تذکرہ نہ ہوا۔ کیا حکومت کو انفراسٹرکچر قائم کرنے کیلئے کردار ادا کرنے کی ضرورت نہیں جس کی ہمارے ہاں شدید کمی ہے اور ایسا کرنے کیلئے کیا حکومت کو بیرونی منڈی سے قرض پر بڑی رقوم حاصل

کرنے کی ضرورت نہیں؟

ج: یہ تو کسی منافقت سے ہرگز کم نہیں کہ ایک تو ہم وسائل کو ضائع کر دیتے ہیں اور پھر یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ہمارا ملک بہت غریب ہے اور اس میں وسائل کی کمی ہے۔ وسائل کا جس قدر ضیاع ہمارے ملک میں ہوتا ہے شاید مغربی یورپ یا امریکہ میں اس کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس پیمانے سے دیکھا جائے تو کیا واقعی ہم غریب ہیں؟

یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس انفراسٹرکچر (بنیادی وسائل) کی کمی ہے اور حکومت کو انفراسٹرکچر کے قیام میں نمایاں کردار ادا کرنا ہوتا ہے لیکن اس بات سے ہمیں ہمیشہ باخبر رہنا چاہئے کہ انفراسٹرکچر کی تعریف اور اس کی ترقی میں حکومت کے کردار سے متعلق نظریات مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ چند برس پیشتر کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ نجی شعبہ اشیائے صرف (روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بمع بجلی پانی ذرائع رسل ورسائل وغیرہ) کی ترقی میں بھی شریک ہو جائے گا کیونکہ یہ کم لاگت کی صنعتوں سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے ان اشیاء پر اجارہ داری قائم ہو جانے کا امکان تھا۔ حالیہ تجربات جیسے اے ٹی اینڈ ٹی کے خاتمے اور برطانیہ میں ٹیلی کوم کی نجکاری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نجی شعبہ بھی ان شعبہ جات میں مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ اب تو یہ خیال عام ہے کہ سڑکیں اور دوسری ذرائع رسل ورسائل کی سہولتوں کی ترقی میں نجی شعبہ خاصی مدد کر سکتا ہے۔

کیا حکومت کو قرض لینا چاہئے یا نہیں اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ نظریاتی طور پر اس تصور سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ قرض کے طور پر حاصل کئے گئے وسائل کو ملک کی ترقی اور معاشی نمو کیلئے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے بہت اکثر قرض پر لی گئی رقم اور گرانٹ ایڈ کو ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔ عوام میں تعلیم کی کمی ہے چنانچہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قرض پر حاصل ہوئے وسائل مہنگے ثابت ہوتے ہیں اور آگے چل کر ٹیکسوں کے بوجھ میں اضافے کا باعث بنتے ہیں دوسری طرف حکومت جو بنیادی طور پر اپنی مدت اقتدار میں اضافے میں دلچسپی رکھتی ہے اس کے لئے غیر ملکی قرض حاصل کرنا بہت آسان ذریعہ ہوتا ہے اور اس سے حکومت کو اپنے حواریوں کی سرپرستی کرنے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ ٹیکسوں کو واپس کرنے کا دردسر تو اگلی حکومت کا ہوگا۔ انہی وجوہات کی بنا پر بہت سے ممالک نے ضرورت سے زیادہ قرض لے لیا۔ کچھ نے اپنی حکومت کی کرپشن کو مزید بڑھانے کے لئے اور دوسروں نے مقتدر طبقے کے لئے تاکہ وہ سرمایہ بیرون ملک لے جا سکے۔ لیکن اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ ایک دوسرے سے وابستہ بین الاقوامی مالیاتی نظام کے باعث اب

قرضہ لے کر واپس نہ کرنا دیوانے کے خواب کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جیسا کہ پاکستان کے بعض سیاستدان اور معاشیات دان سمجھ بیٹھے ہیں۔ لیا ہوا قرض ہر صورت واپس کرنا پڑے گا اور بعض دفعہ تو مقامی سطح پر بہت تکلیف اٹھا کر بھی! چنانچہ اپنے ملک کے معاشی مستقبل کو محفوظ بنانے کے لئے صحیح راستہ تو یہ ہوگا کہ (الف) قرض کی کوئی حد مقرر کر دی جائے۔ (ب) ایسا طریقہ کار وضع کیا جائے تا کہ قرض کے طور پر لئے گئے وسائل کو بہتر طور پر استعمال کیا جا سکے۔ پہلے تو قانون کے ذریعے سے یا آئینی ترمیم کے ذریعے سے ایسا ممکن ہے اور دوسرے نقطے کے حوالے سے یہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک پارلیمانی کمیٹی بنا دی جائے اور وہ یہ اہم کام سرانجام دے۔ لیکن یہ بہت بڑے اور اہم مسائل ہیں جن پر اس مختصر دورانیے کی مجلس میں سیر حاصل گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

س: کاروبار چلانے سے متعلق ایک عملی مسئلے کی طرف آتے ہوئے میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ پاکستان میں بزنس مینجمنٹ کے معیار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: اس موضوع پر تفصیلی مواد اور علم کے نہ ہونے پر اور عمومی مشاہدے پر انحصار کرنے پر آپ سے معذرت کرتے ہوئے جواب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ کچھ کاروباری مراکز تو اس مرحلے تک پہنچ گئے ہیں کہ اب انہیں اپنے اداروں اور کاروبار کو بہتر طریقے سے انتظام چلانے کی قدر و قیمت کا پتہ چل گیا ہے۔ Rent Seekers یا بنا کچھ کئے پیسہ کمانے والوں کہ جنہیں سرکاری لائسنس اور حفاظت مہیا رہتی ہے اور جنہیں سرکاری قرض بھی آسانی سے مہیا ہو جاتا ہے جو بعد ازاں گرانٹ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے یہ لوگ تو طویل المعیاد کاروباری ادارے قائم کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور ان کے علاوہ جو کوئی بھی اپنے طور پر یہ کام کرنا چاہتا ہے تو ان کا ادارہ جلد ہی بند ہو جانے کی قریب آن پہنچتا ہے کیونکہ ٹیکسوں کی زیادتی اور درآمدی رکاوٹوں کے باعث وہ ادارہ اپنے بیشتر وسائل رشوت دینے اور ٹیکس بچانے میں صرف کر دیتا ہے اور یہ دونوں ایسی سرگرمیاں ہیں جن میں بہت سا سرمایہ برباد ہو جاتا ہے۔

ان غلط کاریوں کو حکومت کی پالیسی ہی جنم دیتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہاں اجارہ داریاں قائم ہو گئی ہیں اور امراء کی دولت اور سہولتیں پہلے سے بھی محفوظ دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اس پالیسی کا ایک اہم لیکن بہت نقصان دہ اثر یہ ہوا کہ اس سے مالیاتی منڈیاں (Financial markets) پاکستان میں قائم نہ ہو سکیں۔ ایک مضبوط سٹاک مارکیٹ کاروباری انتظامیہ پر نظم و ضبط قائم رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ موثر سٹاک مارکیٹ ایک چھوٹے پیمانے پر بچت کرنے والے کے سرمایہ کو

بھی ملکی معیشت کیلئے بہتر انداز میں استعمال کرتی ہے اور ملک کی معاشی ترقی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ پاکستان میں چونکہ امراء کے وسائل کو سرکاری سرپرستی حاصل رہتی ہے اس لئے انہیں اپنی کاروباری ضروریات کے پیش نظر مزید وسائل کے لئے مالیاتی منڈیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ آئی جی ایم اور جی ایم جیسی کمپنیاں کبھی کبھار نئے بانڈ یا سٹاک جاری کرتے ہیں لیکن پاکستان میں اکثر کمپنیاں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں کیونکہ ان کی خدمت کے لئے حکومت کے بینک ہوتے ہیں اور جب بھی انہیں سرمائے کی ضرورت ہو وہ ان سے رجوع کرتے ہیں۔ اس لئے کاروبار چند خاندانوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔ کسی بھی کمپنی کی سٹاک مارکیٹ ویلو (Value) سے اس کی اصل قدر یا مضبوطی کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی شیئر ہولڈرز کو ان کا صحیح حصہ ملتا ہے۔ اس لئے نہ تو مارکیٹ کاروباری انتظامیہ پر نظم وضبط قائم کر پاتی ہے اور نہ ہی تھوڑی بچت کرنے والے کو کاروبار اور صنعتی ترقی میں پوری طرح سے سرمایہ کاری کرنے کا موقع ملتا ہے۔

جس طرح سے سوالات کئے گئے اس سے پاکستان میں سوچ کے انداز کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ایسا آخر کیوں ہے کہ حکومت کی انتظامی قابلیت پر کسی قسم کا سوال کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ ہمارے نوآبادیاتی فلسفے کے مطابق کہ حکومت کبھی کوئی غلط کام نہیں کرسکتی ہمیں یہ سوال اٹھانے کا کوئی حق نہیں کہ حکومت ٹھیک کر رہی ہے یا غلط۔ لیکن حقیقت حال تو یہ ہے کہ ہر سطح پر حکومت جدت سے محروم ہے اور اہلیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ اور جمہوری نظام جو ہم نے تشکیل دیا ہے اس میں امراء ہی کو نوازا جاتا ہے اور وہ جو قانون سازی میں سنجیدگی سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں مسترد کر دیا جاتا ہے۔ نوکر شاہی کا نظام انیسویں صدی ہی کے قواعد کے مطابق چل رہا ہے۔ اس کی تنخواہیں اس قدر قلیل ہیں کہ رشوت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اور پیداواری صلاحیت بالکل معدوم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہوگا کہ قواعد کی بھرمار سے حکومت اس قابل ہوگئی ہوئی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں داخل اندازی کر سکے۔ ان تمام اسباب کے باعث حکومت کی نااہلیت کئی گنا بڑھتی جارہی ہے۔ اور ملک کو کئی طرح سے نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ترقی کی رفتار سست ہوگئی ہے ضیاع بڑھ گیا ہے اور ٹیکس بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔

(24)

معاشیات اور معاشی پالیسی: ایک تجزیہ

پاکستان سوسائٹی آف ڈیویلپمنٹ اکانومسٹس کی حالیہ کانفرنس کے دوران رات کے کھانے پر پاکستان کے دو معاشیات دانوں کی معاشیات اور معاشی پالیسی کے موضوع پر دلچسپ گفتگو ہوئی۔ مجھے یہ گفتگو بہت معلوماتی لگی اور میں اس سے بہت متاثر ہوا کیونکہ گفتگو میں دونوں حضرات کے خیالات ونظریات میں وسیع خلیج صاف نظر آ رہی تھی چنانچہ میں نے اس گفتگو کو قارئین تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تا کہ اس سے زیادہ تعداد میں لوگ استفادہ کر سکیں!

گفتگو کو پیش کرنے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ میں دونوں شرکائے گفتگو کا مختصر تعارف کرا دوں! ایک تو ڈاکٹر پھنے خان تھے جو شائستگی تہذیب اور خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ تھے صاف ظاہر کہ وہ سوسائٹی کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شروع ہی سے اعلیٰ سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پہلے وہ ایچیسن کالج گئے پھر کیمبرج اور بعد ازاں آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی کی اور ڈویلپمنٹ اکنامکس کے موضوع پر مقالہ لکھا۔ انہیں اپنی کامیابیوں اور تعلقات پر خاصا فخر ہے۔ اگر انہیں ڈاکٹر کے علاوہ کسی اور نام سے مخاطب کیا جائے تو وہ خفا ہو جاتے ہیں وہ اکثر اپنی آکسفورڈ یا کیمبرج کی ٹائیاں شوق سے لگاتے ہیں اور بڑے اہتمام سے برطانوی لہجہ میں انگریزی بولتے ہیں وہ ان فیبین نظریات کے ساتھ ابھی تک وفاداری کے ساتھ وابستہ ہیں جن سے انہیں آکسفورڈ اور کیمبرج میں واسطہ پڑا تھا اور وہ ان نظریات کا پرچار اخبارات اور جرائد میں کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انہوں نے پاکستان پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ پاکستان کے ایک وفادار ماہر علم ونصاب ہونے کے ناطے سے ان کے مضامین اور کتب پاکستان ہی میں چھپتی رہی ہیں اور پاکستان سے باہر کبھی کسی تحقیقی جرنل میں ان کا کوئی مقالہ نہیں چھپا اور نہ ہی انہیں باہر کی دنیا میں جانا پہنچانا جاتا ہے۔ البتہ پاکستان میں انہیں بہترین ماہر معاشیات کی حیثیت حاصل ہے انہیں ہر سیمینار میں لیکچر دینے کیلئے مدعو کیا جاتا ہے اور وہ پالیسی بنانے میں حکومت کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر پھنے خان (جنہیں ہم ڈاکٹر پی۔ کے مخفف نام سے مخاطب کریں گے) کے بالکل برعکس مسکین شاہ دوسرے شریک گفتگو تھے۔ جو بہت زیادہ مہذب دکھائی نہ دیتے تھے نہ ہی ان کے بہت زیادہ تعلقات تھے۔ پاکستان میں بحیثیت معاشیات دان کے ان کی کوئی خاص شہرت بھی نہ تھی۔ انہوں نے بھی امریکہ کی معروف ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک سے پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ لیکن اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگانا انہیں پسند نہ تھا۔ انہوں نے اکنامک تھیوری کے مطالعے پر زیادہ توجہ دی تھی نہ کہ ڈیویلپمنٹ اکنامکس پر! اکنامک تھیوری کی بین الاقوامی سطح پر تو بہت پذیرائی ہوتی ہے لیکن پاکستان میں اکنامک تھیوری کا کوئی مقام نہیں کیونکہ یہاں ڈیویلپمنٹ اکنامکس کو بہتر طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے تحقیقی مقالے بہت سے بین الاقوامی شہرت کے حامل تحقیقی جرنلز میں چھپ چکے ہیں اور پاکستان سے باہر انہیں اعلیٰ پائے کا نوجوان معاشیات دان تسلیم کیا جاتا ہے لیکن پاکستان میں انہیں کوئی مقام حاصل نہیں۔ ان کا کام تکنیکی نوعیت کا ہے معاشیات کے مشکل مسائل سے متعلق ہوتا ہے اس لئے پاکستانی معیشت کے ناخداؤں کے لئے اس تک رسائی ناممکن سی ہے۔ بدقسمتی سے بین الاقوامی مقابلے میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ پاکستانی اخبارات میں مضامین نہیں چھپوا سکے اور نہ ہی پاکستان پر ایسی کتابیں لکھ سکے ہیں جیسی لوگ پڑھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہیں بین الاقوامی سیمیناروں میں تو مدعو کیا جاتا ہے لیکن پاکستان میں مسلسل نظرانداز کیا جاتا ہے۔ لہذا ڈاکٹر پی۔ کے کو کانفرنس میں شرکت کی باقاعدہ دعوت دی گئی تھی لیکن مسکین شاہ چھٹیوں پر پاکستان آئے ہوئے تھے اس لئے یہاں آ گئے۔

گفتگو سے پہلے ڈاکٹر پی کے نے معیشت کی موجودہ حالت پر طویل لیکچر دیا جس کا آخر میں لب لباب جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا یوں ہے۔

ڈاکٹر پی۔ کے: پاکستان میں بنیادی معاشی مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مناسب اور مربوط منصوبہ بندی مرتب نہ ہوسکی۔ حکومت صحیح طور پر ایسی پالیسیاں وضع نہیں کرسکی جو کہ معاشی نشوونما میں ممد ومعاون ثابت ہوسکیں اور جن کے ذریعے تمام لوگوں کے لئے تعلیم کا بندوبست ہو سکے۔ معاشرے میں خواتین کے کردار میں اضافہ ہو سکے۔ تمام افراد کو روزگار ملے۔ صحت کا نظام بہتر ہو اور ماحول کا تحفظ بہتر انداز میں ہو سکے۔

مسکین شاہ: میرا خیال ہے کہ آپ حکومت سے ضرورت سے زیادہ ہی توقع کر رہے ہیں مجھے آپ جیسے مہذب اور ترقی پسند مفکروں (Dots) کے صبر پر حیرت ہوتی ہے جو ابھی تک حکومت

سے امید لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے گی۔ آپ حکومت کے فرائض میں اس قدر اضافہ کر دیتے ہیں کہ یہ فرائض (اختیارات) لامحدود ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ حکومت ابھی تک محدود پیمانے پر بھی اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہی ہے۔ حکومت کی تمام تر نااہلی کا تجربہ کر چکنے کے بعد حکومتی کردار کی نئے سرے سے تشریح کی جانی چاہئے اور اس کے لئے بہت محدود مقاصد متعین کرنے چاہیں جو کہ وہ حاصل بھی کر سکے اور ان کی بہتر طور پر نگرانی بھی کر سکے۔ اس طرح ہم نجی شعبے کی حد تک منڈی کی قوتوں کا دائرہ عمل بڑھانے میں بھی کامیاب ہو سکیں گے۔

ڈاکٹر پی۔ کے: میرے خیال میں آپ آزاد معیشت کے لئے اپنی امریکی محبت میں بہت دور تک جا پہنچے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے آزاد منڈیوں پر یقین رکھنے والے اس حقیقت کو تسلیم کریں گے کہ پاکستان جیسے تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے غریب ممالک میں نجی شعبہ معاشی ترقی کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ طویل المعیاد معاشی نشوونما کے لئے جس قدر سرمایہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سرمایہ کاری کے لئے بڑی رقوم کو مہیا کرنا تبھی ممکن ہے اگر حکومت اپنی پالیسی کے ذریعے مناسب ترغیبات دے۔ اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ کافی مضبوط صنعتی اور دیگر بنیادی وسائل کی بنیاد فراہم کئے بغیر (بھاری صنعتیں اور رسل ورسائل کی سہولتیں) معاشی نشوونما ممکن ہی نہیں چنانچہ مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ آپ حکومت کو معیشت میں نمایاں کردار ادا کرنے سے کیسے روکیں گے۔

مسکین شاہ: آپ جیسے ترقی پسند مفکرین کے دلائل بنیادی طور پر درج ذیل دو نکات کے گرد گھومتے ہیں (الف) آپ حضرات کو ابتداء ہی سے نجی شعبے پر اعتماد نہیں (ب) آپ لوگ حکومت کی اچھائی اور ذہانت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ نجانے آپ یہ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ نجی شعبہ ترقی کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ ہم نے نجی شعبے کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ہی کب دیا۔ اور آپ حکومت سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کئے بیٹھے ہیں کہ وہ بچتوں اور سرمایہ کاری کے ضمن میں تمام ترغیبات (Incentives) ٹھیک طرح سے مناسب انداز میں دینے کا اہتمام کرے گی اور صنعتوں اور بنیادی وسائل (Infrastructure) کو ترقی دینا اس کی ترجیحات میں شامل ہوگا اور وہ عمومی ترقی پر بھی پوری توجہ دے گی۔ اور اگر آپ کو روکا نہ جائے تو ممکن ہے کہ آپ تعلیم، ثقافت اور مذہب کی ترقی کو بھی حکومت کے فرائض میں شامل کر دیں۔ یہ سب کچھ سرانجام دینے کے لئے آپ کو ایک نیک دل دیوتا کی ضرورت ہوگی نا کہ فانی انسانوں کی قائم کردہ حکومت کی!

ڈاکٹر پی۔کے: یہ حکومت کے مہربان دیوتا بننے یا نہ بننے کا سوال نہیں بلکہ یہ عملی سطح پر ڈیویلپمنٹ اکنامکس کا سوال ہے۔ ڈیویلپمنٹ اکنامکس کے لٹریچر کے ذریعے سے ہم جان سکتے ہیں کہ غریب اور کم آمدنی والے ممالک غربت کے جال میں پھنس جائیں تو انہیں اس جال سے باہر نکالنے کے لئے حکومت کی مداخلت ضروری ہوجاتی ہے۔

مسکین شاہ: مجھے تو اس کا علم نہیں آپ کونسی ڈیولپمنٹ اکنامکس کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ایک ہی معاشی تھیوری ایسی ہے جسے تمام حالات پر منطبق کیا جاسکتا ہے جن میں سے ایک غریب یا ترقی پذیر معیشتوں کے مسائل بھی ہیں۔ چونکہ ابھی تک آپ نے حکومت کو معیشت کے میدان میں اس قدر بڑا کردار ادا کرنے کا موقع دینے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی سوائے اس کے کہ آپ کو نجی شعبے سے متعلق شکوک وشبات ہیں اس لئے مجھے حکومت پر آپ کے اعتماد کی قطعاً سمجھ نہیں آرہی حقیقت تو یہ ہے کہ پچھلے 45 برسوں کے دوران حکومت کی ترقی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور اتنی ہی تیزی سے حکومت کی نااہلی میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر پی۔کے: میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ حکومت کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اور وہ نااہل بھی بہت ہوچکی ہے۔ پھر بھی میں یہ سوچے بنا نہیں رہ سکتا کہ آپ کا نجی شعبے پر اعتماد بھی بے جا ہے کیونکہ نجی شعبے کو انفرادی لالچ تحریک دیتا ہے چنانچہ وہ سماجی بھلائی کیلئے کوئی کام نہیں کرتا جبکہ حکومت سماجی بھلائی کے لئے کام کرتی ہے۔

مسکین شاہ: ترقی پسند مفکرین (Dots) کی اس معیادی دلیل میں ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ یہ اصرار کرتے ہیں کہ نجی شعبہ کو منافع کا لالچ متحرک کرتا ہے لیکن کیا تمام انسان نہیں ہیں؟ کیا ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ حکومت کو ملنے والی تحریک خالص ہوتی ہے اور کیا حکومت بھی افراد پر ہی مشتمل نہیں ہوتی۔ کیا یہ افراد اپنے ان بھائیوں سے کم لالچی ہوتے ہیں جو نجی شعبے میں کام کرتے ہیں۔ کیا ہمیں یہ فرض کرلینا چاہئے کہ یہ لالچی اور اپنے مفادات کو عزیز رکھنے والے جب سرکاری خطابات یا عہدے پالیں گے تو دوسروں کی بھلائی کے لئے کام کرنا شروع کردیں گے؟

ڈاکٹر پی۔کے: لیکن ایک بات آپ کو تسلیم کرنی پڑے گی کہ منڈی کی قوتوں کو بے گام نہیں چھوڑا جاسکتا۔ پاکستان جیسے ممالک میں چونکہ نجی شعبہ بہت چھوٹا ہے اس لئے دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہوگئی ہے۔ اور اجارہ داریاں وجود میں آگئی ہیں جس سے سماجی بہبود کے شعبے میں نقصان ہوتا ہے۔

مکسین شاہ: آپ نے فرض کیا کہ اگر نجی شعبہ پر کنٹرول نہ کیا جائے تو منڈی کی قوتیں اجارہ داریاں بنالیں گی اور آمدنیوں کی تقسیم میں فرق بہت بڑھ جائے گا۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اجارہ داری حکومت کی مداخلت کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتی۔ ایسی پالیساں جیسے لائسنس دینا' حکومتی تحفظ' آسان اور امتیازی قرضہ جات وغیرہ اجارہ داری کے قیام میں معاونت کا باعث بنتی ہیں کیونکہ ان ہتھکنڈوں سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے معیشت میں آزادانہ داخلے کو محدود کر دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر پی۔ کے: مجھے یقین ہے کہ آپ اس سے ضرور اتفاق کریں گے کہ نجی شعبے کا بنیادی محرک منافع کمانا ہوتا ہے نہ کہ معاشرے کی ضرورت یا معیشت کی بھلائی! مثال کے طور پر ایسے منصوبے جیسے ہیوی انجینئرنگ وغیرہ جن کا اتنا لمبا Gestation Period ہوتا ہے اس لئے اس شعبے میں نجی شعبے کے لوگ سرمایہ کاری نہیں کریں گے۔ اور ایسے منصوبے طویل المعیاد معاشی ترقی کے لئے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ صرف حکومت ہی اتنے بڑے منصوبوں سے ہونے والے سماجی فوائد کو دیکھ سکتی ہے اور ایسے منصوبے معیشت کے لئے طویل المعیاد حکومتی پلان کے طور پر تیار کئے جاتے ہیں۔

مسکین شاہ: کسی بھی منصوبے کی قدر متعین کرتے وقت ایک اہم سوال پوچھا جاتا ہے کہ یہ منصوبے کس قدر منافع آور ہوگا اگر یہ منافع آورہ ہو تو Gestation lage کے ہوتے ہوئے بھی نجی شعبہ اس منصوبے کو قبول کرلے گا۔ ہم نے مغرب میں ترقیاتی عمل کے دوران یہ دیکھا کہ نجی شعبے نے ایسے ایسے منصوبوں پر کام کیا کہ جنہیں آجکل سرکاری شعبوں کے لئے ہی مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس کی واضح ترین مثالیں ریلوے' سڑکیں' ٹیلی فون اور بجلی وغیرہ ہیں۔ ان تمام اشیاء کو نجی شعبے ہی نے امریکہ میں ممکن بنایا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ترقی پسند مفکرین (Dots) اور حکومت دونوں ہی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مارکیٹ سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ حالانکہ بار بار وہ غلط ثابت ہو چکے ہیں پھر بھی ان کا یہی اصرار ہے کہ وہ معاشی ترقی کے راستے کو زیادہ بہتر طور سے جانتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں اس طرح کے بڑے بڑے ماڈل ہوتے ہیں جہاں سٹیل اور انجینئرنگ ورکس کے عظیم منصوبوں کے بغیر مناسب معاشی ترقی ممکن نہیں ہوسکتی بیشک یہ منصوبے کسی معاشی نظریئے سے منافع آور ہوں یا نہ ہوں۔

ڈاکٹر پی۔ کے: تو کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ملک میں کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں؟

غربت اور وسائل کی کمیابی کو دیکھتے ہوئے ہماری خواہش تو یہی ہوگی کہ ہم اپنی ترقی کا عمل تیز کریں۔ ہم ایسا تبھی کر سکتے ہیں اگر ہم اپنے وسائل کو صحیح طور پر ترتیب دیں اور تب ہماری نظریں ترقیاتی ترجیحات پر ہی ہونی چاہیں۔ اسے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ تو یہی ہے کہ ہم موثر منصوبہ بندی کریں اور منڈی کے دباؤ میں نہ آئیں۔

مسکین شاہ: تمام ترقی پسند مفکرین (Dots) کی دلیل اس سوچ پر مبنی دکھائی دیتی ہے کہ اگر معیشت اور معاشرے کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو یہ تباہی کے دہانے تک جا پہنچے گا اور حکومت اور ترقی پسند مفکرین (Dots) کی مداخلت کے بغیر امید کی کوئی صورت ممکن نہ ہوگی۔ یہ نہایت ہی خودغرضی پر مبنی دلیل ہے جس کی وجہ سے ترقی پسند مفکرین (Dots) کو کئی حکومتی اور بین الاقوامی ایجنسیوں کی ملازمتیں ملیں۔ منصوبہ بندی پر اصرار خواہ وہ قلیل المعیاد ہو یا طویل المعیاد اس کا مطلب یہی ہے کہ دونوں یعنی حکومت اور اس کے رہائشی دانشور بہتر طور پر یہ جانتے ہیں کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے جبکہ باقی معاشرے کو کچھ پتہ نہیں۔ سب کچھ انہی کے علم میں ہے کہ کونسی اشیاء بنانی ہیں اور انہیں تقسیم کیسے کرنا ہے حتی کہ انہیں صارفین اور پیدا کرنے والوں (Producers) سے بھی سے زیادہ پتہ ہے کہ شے کی قیمت کیا ہونی چاہئے۔ اپنے وسیع علم ہی کی بدولت حکومت لائسنس دینے کی سکیمیں شروع کر دیتی ہے یا رعایات دے دیتی ہے یا پھر دیگر ترغیبات بھی! علاوہ ازیں وہ ترجیحی بنیادوں پر قرضے بھی اسی لئے جاری کرتی ہے کیونکہ اسے باقی تمام معاشرے سے زیادہ علم ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کی کبھی سمجھ نہیں آئی کہ آپ ترقی پسند مفکرین (Dots) ایسا کیوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ آپ لوگوں کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ آپ کے خیال میں آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور ہماری خواہشات کیا ہیں۔

اسی سوچ پر عمل کرتے ہوئے حکومت نے ترقی پسند مفکرین (Dots) کو ملازمتیں فراہم کرنے کے لئے بہت سے تحقیقی مراکز کھول دیئے ہیں۔ ہر سال ہم یہی دیکھتے ہیں کہ معاشیات عمرانیات اوور دیہی ترقی یا دوسری طرح کی ترقیاتی تحقیق کے لئے بہت سے تحقیقی مراکز قائم ہوتے ہیں۔ ان مراکز کے قیام کا سب سے بڑا نتیجہ تو یہی ہوتا ہے کہ ایک نیا ترقی پسند مفکر (Dots) ایک بڑا گھر۔ کار اور اپنی چھوٹی سی سلطنت بنانے کے لئے گرانٹ حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس مرکز میں کوئی کام ہوتا بھی ہے تو وہ بھی بہت تھوڑا! ان مفکرین نے آخر ہمارے لئے' کیا ہی کیا ہے۔ اور ہم انہیں اپنی کمائی میں سے لئے جانے والے ٹیکسوں کے بل بوتے پر عیاشی کیوں کرنے دیں!

ڈاکٹر پی۔کے: دنیا میں ہونے والی حالیہ پیشرفت کے سبب ڈیویلپمنٹ اکنامکس کے تمام ماہرین نے سرکاری شعبے کے کم ازکم کردار کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے اور نجی شعبے کو زیادہ سے زیادہ کردار دینے کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہم اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ حکومت کو اشیاء کی پیدائش کے عمل میں براہ راست ملوث نہیں ہونا چاہئے۔ میں بلکہ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ایسی تمام ترقی کے ماڈل جن میں بعض صنعتوں کو مثلاً سٹیل اور ہیوی انجنیئر نگ کو معاشی ترقی کے لئے لازمی تصور کیا جاتا تھا وہ غلط ثابت ہو گئے ہیں (Comparetive advantage) تقابلی برتری کی تھیوری جس کے مطابق ایک ملک کو وہی کچھ بنانا چاہئے جو وہ دوسروں کے مقابلے میں کم لاگت سے تیار کرسکتا ہے اکثر ترقی پذیر ممالک میں صحیح ثابت ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کے باجود میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ حکومت کئی شعبوں میں بھرپور اور نمایاں کردار ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً بنیادی ضروریات مہیا کرنے کے لئے حکومت کو آگے آنا ہی پڑے گا۔

مسکین شاہ: میرے خیال میں ہم اب ایک بنیادی مسئلے پر آن پہنچے ہیں جس کو حل کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ بنیادی مسئلہ ہے کہ حکومت کا معیشت کے حوالے سے کیا کردار ہونا چاہئے؟ حکومت کے لئے کسی بھی قسم کے کردار کی تشریح کرتے وقت ہمیں اس کی موجودہ صلاحیتوں اور اس کے معیار کی تشخیص کرنا ہوگی۔ جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے موجودہ دور میں حکومت بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ یہ اپنے بہت اہم فرائض میں سے سب سے بنیادی فرض کی بجا آوری میں ناکام ہو چکی ہے یعنی جان و مال کی حفاظت! یہ حکومت کا وہ فرض ہے جو اسے قدیم زمانے سے سونپا گیا ہے اور اسے یہ فرض قبائلی اور جاگیردارانہ معاشروں میں بھی نبھانا ہوتا تھا۔ حتی کہ لوگوں کی بہتری کیلئے بنیادی اشیاء کی فراہمی جیسے صفائی' صاف پینے کا پانی اور دیگر بنیادی ضروریات وغیرہ کو مہیا کرنے میں بھی حکومت نوآبادیاتی دنوں کا معیار بھی برقرار نہیں رکھ سکی۔ اس لئے میں تو حکومت سے کسی قسم کی توقع رکھنے کے حق میں قطعاً نہیں ہوں۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ حکومت میں درآنے والی نااہلی کے ساتھ ساتھ کرپشن اور اقربا پروری کی لعنتیں بھی شامل ہوگئی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کسی بھی قسم کا کام کرنے کے قابل نہیں رہی نہ ہی وہ کسی ضابطے یا قاعدے کو خاطر میں لاتی ہے۔ اس لئے اس سے پہلے کہ ہم حکومت سے کسی قسم کی پالیسی وضع کرنے کو کہیں مذکورہ بالا حقائق کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے۔

ڈاکٹر پی۔کے: ترقی کرنے کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم دو شعبوں میں ترقی پر زور دیں

(الف) آبادی میں اضافہ کو روکیں (ب) خواندگی کی شرح کو بڑھائیں۔ اب میرے لئے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ حکومت کی کوششوں اور اس کے سرمائے کے بغیر یہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟

مسکین شاہ: آپ کے حکومت پر یقین کو دیکھ کر مجھے تعجب ہو رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حکومت نے کئی اعلانات کئے اور کئی دفعہ بجٹ سے رقم بھی مختص کی اور منصوبے بھی بنائے لیکن نہ تو آبادی میں اضافے پر قابو پایا جا سکا اور نہ ہی شرح خواندگی میں کوئی قابل ذکر اضافہ دیکھنے میں آیا۔ لیکن پھر بھی ترقی پسند مفکرین (Dots) حکومت کو ان مدوں کے لئے مزید رقوم مختص کرنے کو کہتے رہتے ہیں نجانے کیوں؟

ڈاکٹر پی۔ کے: آپ کی دلیل یقیناً قائل کرنے والی ہے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ اب حکومت کے کردار کی دوبارہ سے تشریح کی جانی چاہئے۔ یقینی طور پر ماضی میں حکومت کچھ بھی کرنے میں ناکام رہی ہے اور میں آپ کے اس نقطے سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ ہمیں حکومت سے زیادہ توقعات نہیں رکھنی چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ ہم حکومت سے برے کی توقع رکھیں بجائے اس کے کہ اچھے کی جیسا کہ ہم ماضی میں کرتے آئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب کچھ نجی شعبے کے سپرد کر دیا جائے۔ غالباً بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ سرکاری شعبے میں خودمختار ادارے قائم کئے جائیں جن کے واضح معاشی مقاصد ہوں۔

مسکین شاہ: ترقی پسند مفکرین (Dots) کی معیاری تجویز یہی ہے کہ نئی ایجنسی بنا دی جائے شائد وہ یہ تجویز اس لئے دیتے ہیں کہ اس نئی ایجنسی میں اسی ترقی پسند مفکر کو مقرر کر دیا جائے گا اور حکومت کا معیاری ردعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ بجٹ میں سے رقم مختص کر دیتی ہے پھر نئی ایجنسی وجود میں آجاتی ہے اور حکومت کا کوئی چہیتا اس کا چیئرمین مقرر ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک نئی تنظیم وجود میں آجاتی ہے۔ چیئرمین اور اس کے پسندیدہ افراد کو سہولتیں اور پیسہ مل جاتا ہے جبکہ ان پر کوئی ذمہ داری یا جوابدہی کا خوف قطعاً نہیں ہوتا۔ اب سالہا سال گزر جائیں گے لیکن وہ تنظیم کچھ نہ کرے گی صرف ہر سال اس کے حصے کی مختص کی جانے والی رقم میں اضافہ ہو جائے گا اس کے باوجود کہ تنظیم کے اخراجات بڑھتے جائیں گے لیکن وہ کچھ بھی کر کے نہ دکھائے گی۔ دراصل اکثر حوالوں میں یہی دیکھا گیا ہے کہ تنظیم کے چارٹر میں کچھ گائیڈ لائنز دے دی جاتی ہیں۔ اور تنظیم کے مقصد اور پیداوار کی وضاحت کی تکلیف گوارا نہیں کی جاتی۔

ذاتی طور پر میں ترقی پسند مفکروں (Dots) سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ کسی نئی تنظیم کے

یہ مکالمہ فرضی ہے۔ مصنف نے اپنے خیالات وافکار کو دلچسپ بنانے کے لئے اس گفتگو کا سہارا لیا ہے۔

اجراء کی سفارش کرتے وقت بہت احتیاط سے کام لیں۔اب وقت آن پہنچا ہے کہ عوام اور یہ مفکر مل کر انتظامیہ سے کہیں کہ وہ واضح کسوٹی بنائیں تا کہ ان تنظیموں کی (الف) پیداوار اور (ب) رقوم کے لئے مطالبات کی جانچ پڑتال کی جا سکے۔اس کے ساتھ ساتھ تمام اطراف سے یہ اصرار بھی کیا جانا چاہئے کہ کوئی اصول بنایا جائے جس سے یہ ممکن ہو جائے کہ حکومت کا رول کم سے کم ہو جائے۔لیکن کیا کسی مفکر (Dots) نے کبھی یہ سفارش کی ہے کہ فلاں ادارے کو بند کر دیا جائے کیونکہ یا تو وہ کوئی بھی کام کرنے کے قابل نہیں یا وہ اپنی افادیت کھو چکا ہے۔

ڈاکٹر پی۔کے: آپ درست کہتے ہیں۔حالات و واقعات حکومت کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔کرپشن اور وسائل کے ضیاع میں زیادتی واقعی حکومت کی غفلت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اور ہاں حکومت بہت سے ایسے مقاصد کے حصول میں ناکام رہی ہے جو کہ اس نے اپنے لئے متعین کئے۔ ایجنسیوں کے بارے میں بھی آپ کا کہنا صحیح ہے کہ یہ ترقی کی رفتار کو بڑھانے کے لئے قائم کی جاتی ہیں لیکن بعد ازاں ان کی حیثیت بااثر افراد کی جاگیروں سے زیادہ نہیں رہتی۔سوائے ایک ایسے گڑھے کے جس کا پیندا ہی نہیں ہوتا کہ جس میں جتنا پیسہ ڈالتے جائیں اس میں غائب ہوتا چلا جائے گا اور اس کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

میں آپ کی اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ ماضی میں ہم ڈیویلپمنٹ اکانومسٹوں نے معاشی ترقی کے لئے حکومت کی اہلیت پر بہت زیادہ اعتماد کئے رکھا۔یہ نو آبادیاتی دور کے بعد جنم لینے والی قوموں میں موجزن امید کی وجہ سے ہوا۔نئے ممالک ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اعتماد تھا کہ مناسب سمت دینے کے بعد ان کی معیشتیں تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کریں گی اور لوگوں کی فلاح میں اضافہ ہو گا بجائے اس کے کہ معیشت کی سرے سے کوئی سمت ہی نہ ہو۔ اداروں کی کمی اور نجی شعبے کے اختصار کے ہوتے ہوئے معیشت کو سمت دینے کا فریضہ حکومت کے سوا کسی اور کو نہ سونپا جا سکتا تھا۔حکومت نے یہ کام سنبھال لیا اور اس کی حوصلہ افزائی ترقی پسند مفکرین (dots) (آپ کے بقول) نے کی۔اور بعد میں یہ حضرات ایک صنعت کا روپ دھار گئے۔یہ ہر وقت یہی سوچتے رہتے تھے کہ معیشت میں حکومت کے کردار کو بڑھانے کے اور کون کون سے طریقے ہو سکتے ہیں۔بعد میں تو یہ ایک گھن چکر سا بن گیا حکومت ان لوگوں کو ملازمتیں فراہم کرنے کی خاطر وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی اور یہ لوگ اس وسعت کا جواز گھڑتے گئے۔

نتیجتاً آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اگرچہ ہم نے مختلف فکری راہیں اپنائیں لیکن شہادت اور

ثبوتوں کی وجہ سے اب ہمارے میں بہت کم اختلاف رہ گیا ہے۔حتی کہ ہم ترقی پسند مفکرین (Dots) بھی کافی تبدیل ہو چکے ہیں۔ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے حکومت کی پلیٹ میں ضرورت سے زیادہ کھانا ڈال دیا جس کا نتیجہ بدہضمی (کرپشن نااہلی اور ضیاع) کی صورت میں ہوا۔ہم مستقل کے لئے حکومت کے زیادہ باعمل اور حقیقت پر مبنی کردار کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔میرے خیال میں اب حکومت کو نجکاری اور ڈی ریگولیشن (Deregulation) کی پالیسی کو اپنا لینا چاہئے اور ترقی کے عمل کو تیز کرنے کے لئے مناسب ترغیبات دینی چاہیں۔مثال کے طور پر گنجلک پالیسیوں کے بغیر مزدوروں کو ترغیبات دی جاسکتی ہیں۔

مسکین شاہ: مجھے خوشی ہے کہ ترقی پسند مفکرین (Dots) کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی آئی ہے اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ان مفکرین کی چھٹی اور ساتویں دہائی والی سوچ غلط ثابت ہو چکی ہے اور یہ لوگ اب اپنی غلطی تسلیم بھی کر رہے ہیں۔اس کے باوجود ان دو طرح کی سوچوں میں بہت نازک سا فرق ہے۔مفکرین (Dots) اور معاشیات دان ابھی بعض باتوں پر اصرار جاری رکھے ہوئے ہیں۔اب جبکہ آپ حضرات ریاست سے متعلق پرانے Fabian تصورات کو چھوڑتے جا رہے ہیں پھر بھی آپ کی خواہش یہی ہے کہ ترقی کی راہ پر حکومت ہی رہنمائی کرے۔مجھے اجازت دیں کہ میں اسے مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرسکوں۔

حکومت کا کردار کس قسم کا ہونا چاہئے۔اس کردار کی تشریح کرتے ہوئے میرے خیال میں ہمیں ابتداء اس نظریئے سے کرنی چاہئے کہ حکومت جو بھی کرے گی برا ہی کرے گی۔ہمارا ابتدائی مفروضہ یہی ہوگا اور یہ مفروضہ اس وقت تک قائم رہنا چاہئے جب تک کہ حکومت کو ہمارے اس نظریئے کی اطلاع نہیں ہو جاتی اور وہ اپنے آپ کو تبدیل کر لینے پر تیار نہیں کر لیتی۔حکومت پر ہمارے شکوک کا مظاہرہ ہو جانے کے بعد ہمیں اس بات پر اتفاق رائے کرنا ہوگا کہ حکومت کا دائرہ عمل اور سائز کم کیا جائے۔ماضی میں پبلک سیکٹر مارکیٹنگ بورڈز' گورنمنٹ ایگریکلچرل ایکسٹینشن سروس آرگنائزیشن اور ایکسپورٹ پروموشن بیورو جیسی تنظیموں کو قائم کرنے کے خواب دیکھے جاتے رہے ہیں۔اب مناسب وقت آن پہنچا ہے کہ حکومت کے مختلف محکموں اور دوسرے سرکاری شعبے کے اداروں کا بغور مطالعہ کر کے ان اداروں اور محکموں کی نشاندہی کی جائے کہ جنہیں بند کر دینا مفید ہوگا۔

میں معاشی پالیسی کے ضمن میں حکومت کی قابلیت یا قواعد وضوابط میں بہتر تبدیلی کے لئے

بنائی جانے والی پالیسیوں کو شک کی نظر سے دیکھوں گا جب تک کہ ان کوششوں سے پہلے حکومت کے
سائز کو کم کرنے کے لئے موثر اقدامات نہیں کئے جاتے۔

(25)

حکومتی قرضے کے مضمرات

س: ہماری مالیاتی پالیسی کا دوسرے ترقی پذیر ممالک کی مالیاتی پالیسیوں کے ساتھ کیسے موازنہ کیا جاسکتا ہے؟

ج: پچھلی دو دہائیوں کے دوران پاکستان کی مالیاتی پالیسیوں کی بنیاد بڑے خساروں پر رہی ہے دوسرے ممالک کی مالیاتی پالیسیوں کا پاکستان کی پالیسی کے ساتھ موازنہ کرتے وقت ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان دونوں کے خساروں کا ان کی خام ملکی پیداوار کے ساتھ کیا تناسب ہے۔ اگر موازنے کا یہ طریقہ اپنایا جائے تو ثابت یہ ہوگا کہ ہمارا مالیاتی خسارہ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

س: عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خسارہ بہت زیادہ ہو جائے تو یہ اونچے درجے کے افراط زر پر منتج ہوتا ہے اب سوال یہ ہے کہ اس قدر زیادہ خساروں کے ساتھ ہم افراط زر سے کیسے بچے ہوئے ہیں؟

ج: اتنے بڑے خساروں کو پورا کرنے کی کوشش میں ملک میں بہت سے گھمبیر معاشی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے ایک اونچے درجے کا افراط زر بھی ہے۔ مالیاتی خسارہ تب جنم لیتا ہے جب حکومت نہ تو ٹیکس بڑھا سکتی ہے اور نہ ہی سیاسی وجوہات کی بنا پر اپنے اخراجات کو کم کر سکتی ہے۔ اسی لئے اب حکومت کے پاس اپنے اخراجات اور آمدنی میں فرق کو کم کرنے کے لئے صرف دو راستے رہ جاتے ہیں (الف) یا تو زیادہ نوٹ چھاپ لئے جائیں (ب) اندرون ملک یا بیرون ملک سے قرض لے لیا جائے۔ پہلے راستے پر چل کر ملک میں افراط زر کی راہ ہموار ہوتی ہے جبکہ دوسرا راستہ قرض لینے کا ہے۔ اس سے حکومت کو مستقبل میں مزید وسائل مہیا کرنے پڑتے ہیں کیونکہ اسے قرض پر سود بھی دینا پڑتا ہے۔ قرض کی واپسی پر جب کافی وسائل خرچ ہو جاتے ہیں تو بھی اخراجات کی مد میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اخراجات کو مستقبل میں کسی اور ذریعے سے کم کرنے کی ضرورت ہے۔

ہماری حکومت اگر مزید نوٹ چھاپ کر مالیاتی خسارہ پورا کرنے کی کوشش کرتی تو ہمارے

ہاں افراط زر بہت اونچے نقطے تک جا پہنچتا۔حکومت نے خسارہ پورا کرنے کے لئے قرض لینے کی راہ کواختیار کرنا پسند کیا۔مزید برآں حکومت نے اندرون ملک اور بیرون ملک کافی رعایتی شرائط پر قرض حاصل کرلیا۔قرض دہندگان نے حکومت کو یہ رعایت دی کہ اس پر سود کی شرائط کو نرم کردیا۔اس رعایت کے باعث حکومت کو زائد کرنسی نوٹ چھاپنا نہ پڑے۔ لہذا ہم اونچے درجے کے افراط زر سے بچ جانے میں کامیاب ہو گئے۔یادرہے کہ عموماً افراط زر کے بعد مالیاتی خسارہ جنم لیتا ہے لیکن قرض دہندگان کی فیاضی یا بیوقوفی کی وجہ سے ہم اس سے بچ گئے۔

س: ایسا لگتا ہے کہ اگر ہم اسی پالیسی پر عمل کرتے رہے تو ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ہمیں نہ تو اخراجات کم کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ٹیکس بڑھانے کی! ہم پھر بھی افراط زر کی شرح کم رکھ سکتے ہیں؟

ج: کئی وجوہات کی بنا پر اس پالیسی پر آئندہ برسوں میں عمل کرنا بہت مشکل ہوگا۔اور یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ آئندہ برسوں میں بڑھا ہوا مالیاتی خسارہ ہماری معیشت کے لئے انتہائی خطرناک ہوگا۔اوراس خسارے کو کم کرنا بھی آسان نہ ہو گا لیکن جیسے حالات ہیں اگر خسارہ کم نہ کیا گیا تو اس کا متبادل اس سے بھی زیادہ مشکل صورتحال کو جنم دے گا۔مثلاً اگر خسارے کو کم نہ کیا گیا تو ہمیں افراط زر کی انتہائی اونچی شرح کو برداشت کرنا پڑے گا جیسا کہ زیادہ مالیاتی خسارے سے دوچار ہونے والے دیگر ممالک کو اسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔البتہ ابھی تک تو قسمت نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔

س: لیکن اگر میں آپ کے پچھلے نقطے کو سمجھ سکا ہوں تو کیا ہم مالیاتی خسارے کو پورا کرنے کے لئے افراطِ زر سے زائد نوٹ نہ چھاپ کر بچ سکتے ہیں؟ کیا ہم سستی شرائط پر قرض لے کر نوٹ چھاپنے کے اس عمل سے اجتناب کر سکتے ہیں؟

ج: ایسی مالیاتی پالیسی جس کی بنیاد خسارے کو قرض لے کر پورا کرنے کے عمل پر ہو اور جو پالیسی پچھلی دو دہائیوں سے جاری ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے جو کہ ہمارے ہاں ہوا یعنی حکومت نے اس قدر قرض لے لیا ہے کہ وہ پاکستان کی معیشت کے مجموعی حجم سے بھی بڑھ گیا ہے۔اب دلچسپ سوال یہ ہے کہ کیا حکومتی قرض اسی طرح بے مہار بڑھتا رہے گا۔جونہی قرض بڑھتا جاتا ہے اس کی واپسی کا تقاضا بھی اسی طرح بڑھتا جائے گا جب وہ قرض واپس ہوگا تو صاف ظاہر ہے اخراجات بھی بڑھیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خسارہ پھر اپنی شدید ترین شکل میں ظہور پذیر ہوگا۔ جب قرض

دہندگان یہ دیکھیں گے کہ قرض بہت زیادہ بڑھ چکا ہے تو رقم واپس نہ ملنے کا خدشہ انہیں چوکنا کر دے گا اور وہ شکوک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ چونکہ قرض کی رقم واپس کرنے سے انکار کر دینا کوئی نئی بات نہیں۔ ممالک یہ کام عرصہ دراز سے کرتے رہے ہیں اس لئے قرض دہندگان اب حاصل کئے جانے والے قرضوں پر نظر رکھیں گے اور وہ مزید رقم دینے میں پس وپیش سے بھی کام لیں گے اور اگر ابھی آپ کا قرض اس سطح تک نہیں بھی پہنچا تو قرض دہندگان سود کی شرح بڑھا کر مزید قرض لینے کے سلسلے میں آپ کی حوصلہ شکنی کریں گے۔ چنانچہ ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ حکومت کو ہمیشہ سستی شرائط پر قرض ملتا رہے گا۔

میں یہاں ان جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیوں کا ذکر نہیں کروں گا جن کی وجہ سے مغرب اور خصوصاً امریکہ نے پاکستان کو ماضی کی نسبت کم اہمیت دینا شروع کر دی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے باعث ہمیں پہلے کی طرح رعایتاً قرض یا امداد فراہم نہیں ہو رہی اور اس کا بھی امکان ہے کہ مستقبل میں یہ امداد بالکل ہی بند ہو جائے۔ لیکن میں اس پہلو پر اظہار خیال نہیں کروں گا کیونکہ ہمارے اخبارات اس افسوس کا اظہار کرنے کے لئے ہی مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں کہ سیاسی وجغرافیائی حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ البتہ مستقبل کے لئے یہ کہہ دینا بہت کافی ہے کہ ہمیں کم سود پر قرضے آسانی سے نہیں ملیں گے۔

س: آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ غیر ملکی قرض دہندگان کے ضمن میں تو صحیح لگتا ہے کیونکہ وہ زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں اور سیاسی حالات کو بھی نظر میں رکھتے ہیں، پچھلے کئی برسوں سے حکومت کا زیادہ انحصار غیر ملکی قرض کی بجائے ملکی قرض پر رہا ہے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مقامی قرض دہندگان اسی شرح پر قرض دیتے رہیں گے جس پر انہوں نے ماضی میں دیا۔

ج: ملکی قرض میں آٹھویں صدی کے دوران بہت تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب باہر گئے ہوئے پاکستانی کافی مقدار میں غیر ملکی پیسہ پاکستان بھیج رہے تھے اور ساتھ ہی کالی معیشت بھی پنپ رہی تھی چنانچہ لوگوں کے پاس بہت پیسہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ چونکہ اس وقت سرمائے کو باہر منتقل کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی باہر اپنے اکاؤنٹ رکھنا اتنا آسان تھا۔ باہر کے ممالک میں پیسے کو چھپا کر رکھنے کی اچھی بھلی قیمت بھی دینا پڑتی تھی۔ اس لئے پیسہ ملک ہی میں زیر گردش رہا اور یہیں پر سرمایہ کاری میں استعمال ہوا۔ چونکہ ملک میں سرمایہ کاری کے امکانات بھی کافی تھے اس لئے حکومت کی جانب سے لئے جانے والے قرض کی شرائط کو پرکشش بنا دیا گیا۔ وہ پیسہ جو شہری حکومت کو

قرض پر دیتے تھے اس پر ٹیکس کی چھوٹ دی گئی اور سود کی شرح میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا۔ اس لئے ان برسوں کے دوران حکومتی قرض کی طلب بہت بڑھ گئی اور حکومتی قرض بھی بڑھتا چلا گیا۔

اب صورتحال دو وجوہ کی بنا پر تبدیل ہو گئی ہے پہلی وجہ یہ ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ حکومت کے حاصل کردہ قرض میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ مزید قرض حاصل کرنا اس کے لئے سہل نہیں رہا دوسری وجہ یہ ہے کہ اب معیشت آزاد ہو گئی ہے اور یہاں کے رہائشی غیر ملکی کرنسی میں اکاؤنٹ کھلوا سکتے ہیں نہ صرف پاکستان میں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی۔ چنانچہ پاکستانی اپنی جمع شدہ رقم پر وہی شرح سود لینا چاہیں گے جو کہ بین الاقوامی منڈی میں غیر ملکی کرنسی کی شکل میں جمع شدہ رقم پر حاصل ہونے والی شرح سود کے مطابق ہو گی۔ مزید برآں غیر ملکی کرنسی کے اکاؤنٹ پر مالیاتی ادارے جو سود ادا کریں گے وہ بھی غیر ملکی کرنسی ہی میں ہو گا۔ لہذا یہ اکاؤنٹ ہولڈر ملکی کرنسی کی شرح میں کمی آ جانے سے انہیں ہونے والے فائدے کو بھی محسوس کریں گے۔ اگر کھاتے داروں میں غیر ملکی کرنسی کے اکاؤنٹ اور ملکی کرنسی کے اکاؤنٹ کا امتیاز ختم کرنا مقصود ہو تو ملکی کرنسی پر بین الاقوامی شرح کے مطابق سود دیا جانا چاہئے اور روپے کی قدر میں کمی کی صورت میں اضافی سود بھی دیا جانا چاہئے۔ ماضی میں شرح تبادلہ کے رجحان اور ملکی و غیر ملکی شرح سود کے موازنے کے بعد یہ توقع کرنا بیجا نہ ہو گا کہ آئندہ برسوں کے دوران حکومتی قرضوں پر شرح سود میں اضافہ ہو گا۔

حکومتی قرضوں میں اس قدر اضافے کی وجہ سے قرضوں کی واپسی (Debt Servicing) حکومت کے اخراجات کی نمایاں مدوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور حکومتی قرضوں پر دیئے جانے والے سود کی شرح کو اگر مزید بڑھا دیا گیا تو حکومت کے اخراجات میں لازماً اضافہ ہو گا جس سے مالیاتی خسارے میں بھی زیادتی ہو گی۔ اس لئے خسارے کو کم کرنے کی سنجیدہ کوششوں کی عدم موجودی کی وجہ سے یہ مسئلہ گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتا چلا جائے گا کیونکہ اب حکومتی قرض پر سود کی شرح میں اضافہ ہو گا کمی نہیں!

س: اگر حکومت کے لئے قرض لینا مشکل ہو گیا اور قرضے پر شرح سود بھی بڑھ گئی تو آپ کے نزدیک حکومت کی ترجیحات کیا ہونی چاہیں؟

ج: ان حالات میں کہ جب حکومت کے لئے مزید قرض کا حصول ممکن نہ رہے تو اسے اپنے اخراجات کو کم کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اگر اس کے لئے مختلف وجوہات مثلاً گھریلو، سیاسی یا شدید دفاعی وغیرہ کی بنا پر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اس لئے دو راستے رہ جاتے ہیں یا تو وہ

خسارے کومزید نوٹ چھاپ کرکم کرے یا پھر ٹیکسوں کے ذریعے سے اپنی آمدنی بڑھائے۔ اٹلیکچوئل سطح پر اگر بات کی جائے تو دونوں راستوں کی منزل ایک ہی ہے۔ اگر زیادہ نوٹ چھاپے جائیں تو افراط زر کی شرح میں بیحد اضافہ ہو جائے گا کیونکہ زیادہ روپے گردش میں ہونگے اور خریدی جانے والی اشیاء کی مقدار اتنی ہی رہے گی افراط زر کی بڑھتی ہوئی شرح کا یہ بھی نتیجہ نکلے گا کہ پیسہ رکھنے والوں کی قوت خرید میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اس طرح سے روپے چھاپ کر جب خسارے کو کم کیا جائے گا اور افراط زر کی شرح بڑھنے دی جائے گی تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ حکومت ان لوگوں پر جن کے پاس تھوڑا بہت پیسہ ہے ٹیکس لگا رہی ہے۔ اس ضمن میں معاشیات دان یہ دلیل دیتے ہیں کہ حکومت ایک ہی نوعیت کے دو ٹیکس لگا کر آمدنی بڑھا سکتی ہے۔ انفلیشن ٹیکس کے ذریعے سے اوور روایتی ٹیکسوں سے۔ ان دونوں طرح کی ٹیکسوں میں فرق یہ ہے کہ انفلیشن ٹیکس لگانے کے لئے کسی قانون سازی کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ روایتی ٹیکسوں کے لئے قانون سازی کرنا ضروری ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انفلیشن ٹیکس خاموشی کے ساتھ وصول کرلیا جاتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں ان دونوں ٹیکسوں میں سے انفلیشن ٹیکس پر زیادہ انحصار کیا جاتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کیونکہ پچھلے کئی سالوں سے حکومت متعدد کوششوں کے باوجود روایتی ٹیکسوں کی ٹھیک طرح سے وصولی میں ناکام رہی ہے۔ ٹیکسوں کی بنیاد کو وسیع کرنے پر بھی اسے سیاسی سطح پر شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے مزید یہ کہ ٹیکس نہ دینے کی روایت بھی ہمارے ملک میں زوروں پر ہے اور یہ روایت مزید راسخ ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے حکومت جب بھی مالیاتی دشواریوں میں گھرتی ہے تو اسے آسانی اسی میں نظر آتی ہے کہ افراط زر کے ذریعے ان دشواریوں پر قابو پائے۔

جب بھی حکومت زیادہ نوٹ چھاپ کر اپنے خسارے کو پورا کرتی ہے تو اسے ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نے جو ملک کے اندر سے قرضے حاصل کئے ہوتے ہیں ان کی قدر میں کمی آجاتی ہے چونکہ یہ تمام قرضے روپوں میں لئے ہوئے ہوتے ہیں جب بھی افراط زر کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے تو قرضے کی قدر میں کمی آجاتی ہے اور حکومت کے لئے اس کی واپسی آسانی ہو جاتی ہے۔ اور افراط زر کی اس قدر بڑھتی ہوئی شرح کا نتیجہ بالاخر یہی نکلتا ہے کہ قرض خواہوں کو جب پیسے واپس ملتے ہیں تو وہ بے قیمت کاغذ بن چکے ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس سارے عمل کی مکروہ جہت یہ ہے کہ ریٹائرڈ بیوہ خواتین یا یتیم حکومت کی قرض والی سکیموں میں یہ سمجھ کر پیسہ لگاتے ہیں کہ یہ سرمایہ

کاری کا محفوظ ترین طریقہ ہے لیکن جب ان پر اصلیت واضح ہوتی ہے تو ان کی حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

س: افراط زر کی بہت بلند شرح لاطینی امریکہ کے ممالک کی خاصیت ہے۔ پاکستان میں بہت محدود افراط زر کی روایت رہی ہے۔ یہ بہت مشکل دکھائی دیتا ہے کہ پاکستان کے معاشی ڈھانچے میں کوئی ایسی تبدیلی آئے جس سے یہاں افراط زر کی شرح بہت بلند ہو جائے۔ آپ کے خیال میں وہ کونسی وجوہات ہیں جو افراط زر کی شرح بہت بلند کر سکتی ہیں؟

ج: آیئے موجودہ صورتحال کا تجزیہ کرتے ہیں۔ آپ یہ بات نوٹ کریں کہ پاکستان میں رہائش پذیر لوگ اب ملک کے اندر یا ملک کے باہر غیر ملکی کرنسی میں اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں۔ یہاں کے پیسے رکھنے والے حضرات جب یہ دیکھیں گے کہ غیر ملکی کرنسی پر سود کی شرح کہیں زیادہ ہے تو وہ اپنے اکاؤنٹ مقامی کرنسی میں رکھنے سے اجتناب کریں گے اس طرح غیر ملکی اکاونٹوں میں اضافہ اور مقامی کرنسی میں کھولے جانے والے اکاؤنٹوں میں کمی ہوتی جائے گی۔

جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ حکومت حاصل کئے ہوئے قرضوں کو جب سود کے ساتھ واپس کرے گی اور اخراجات جوں کے توں ہی رہیں گے تو اس کے وسائل میں شدید کمی آ جائے گی اور اسے اپنے وسائل اور آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے ٹیکس لگانا پڑیں گے۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرز کے ٹیکس سے بچنے کیلئے وہ کرنسی کو تبدیل کرنے کو ترجیح دیں گے اور مجموعی طور پر کرنسی کے تبادلے میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح لوگ ٹیکسوں سے بچ جائیں گے اور مقامی کرنسی میں جمع شدہ رقوم میں کمی واقع ہو جائے گی۔ ان حالات میں خسارے کو کم کرنے کیلئے اگر مزید نوٹ چھاپے جائیں گے تو افراط زر کی شرح میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا کیونکہ اب مقامی کرنسی کی بنیاد مزید سکڑ چکی ہو گی اس لئے کہ کرنسی کا تبادلہ ہو گیا ہو گا۔ اس سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ خسارے میں کمی نہ کر کے ہمیں مستقبل میں افراط زر کی بلند شرح کا سامنا کرنا پڑے گا۔

س: آپ نے آئندہ برسوں میں مالیاتی خسارے کو کم کرنے کے حق میں بہت موثر دلائل دیئے ہیں۔ شاید آپ ہمیں اس کے بارے میں بھی کچھ بتا سکیں کہ خسارے کو کم کیسے کیا جائے۔

ج: قرضوں کو کم کرنے کے لئے حکومت کے پاس صرف دو راستے ہیں یا تو وہ اپنے اخراجات کو کم کرے یا اپنی آمدنی میں اضافہ کرے۔ آیئے ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ غور کرتے ہیں! ٹیکسوں میں اضافہ کرنے سے نجی شعبہ کے پاس سرمایہ کم ہو جائے گا اور اس کے اخراجات بھی کم ہو جائیں

گے۔جس کا اثر یہ ہوگا کہ ترقیاتی عمل کی رفتار سست ہو جائے گی اور نجی شعبے کے مسائل میں اضافہ ہو جائے گا۔

جہاں تک اخراجات کا سوال ہے تو ہمیں اس اصول کی طرف متوجہ ہونا ہوگا جس کو ہمارے ملک میں بالکل خاطر میں نہیں لایا جاتا یعنی ضیاع کا خاتمہ اور نااہلی کا قلع قمع! یہ بات تو زبان زد عام ہے کہ حکومت بڑی نااہل ہے۔اب یہ وقت آن پہنچا ہے کہ حکومت کی نااہلی کا سدباب کیا جائے اور اس کے اخراجات کو کم کر کے بچت کو بڑھانے کی ترکیب کی جائے۔علاوہ ازیں حکومت بعض ایسے شعبوں میں بھی ملوث ہے جس میں اس کا کوئی کام سرے سے ہے ہی نہیں جیسے اشیاء کی پیدائش، ادبی وثقافتی انجمنوں اور تنظیموں کی سرپرستی وغیرہ حکومت کو ان شعبوں میں دخل دینے سے باز رکھ کر بھی بچتوں میں کافی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ضیاع کو ختم کر کے اخراجات میں کمی کی طرف بھرپور توجہ دی جا سکتی ہے۔ اخراجات کو کم کرنے کے بھی دو راستے ممکن ہیں یا تو جاری اخرجات کم کئے جائیں یا ترقیاتی اخراجات کو کم کیا جائے۔ ماضی میں جب بھی اخراجات میں کمی کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو ترقیاتی اخراجات ہی کو کم کیا گیا۔چنانچہ اس پالیسی اور حکومت کی نااہلی نے معاشی ترقی کی رفتار کو بالکل سست کر دیا اور بنیادی وسائل کی فراہمی میں بھی تعطل آ گیا۔اس لئے یہ نہایت ہی واضح حقیقت ہے کہ حکومت کے ترقیاتی اخراجات کو مزید کم کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں بلکہ اگر کسی چیز کی اشد ضرورت ہے تو وہ حکومت کی اہلیت کے معیار میں اضافہ کرنے کی ہے۔

اس گفتگو کا خاتمہ کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خسارے کو کم کرنے کے لئے نہ صرف حکومت کی طرف سے وسائل کے ضیاع کا خاتمہ ضروری ہے بلکہ حکومت کے جاری اخراجات کو بھی کم کرنا اشد ضروری ہے جب یہ مقاصد حاصل ہو جائیں گے اور حکومت اپنی تمام غیر ضروری سرگرمیوں سے ہاتھ کھینچ لے گی تب اگر ضرورت محسوس ہو تو ٹیکس لاگو کئے جا سکتے ہیں۔البتہ حکومت کے ترقیاتی اخراجات کو برقرار رکھنا ضروری ہے بلکہ انہیں اگر بڑھانا مقصود ہو تو بڑھا دینا چاہئے مگر ان کا استعمال صحیح طور پر ہونا چاہئے۔

(26)

کرایہ طلبی کے بڑھتے ہوئے رجحانات

رینٹ یا کرایہ ایسی کمائی کو کہتے ہیں جس میں انسانی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا رینٹ ایسی آمدنی ہوتی ہے جو عطا کردہ کسی شے کو اپنی ملکیت میں لے لینے کے بعد اس سے وصول کی جاتی ہے۔ رینٹ (کرایہ) کی وصولی کی ابتدائی مثالیں اس وقت کی ہیں جب کسی کو ''ڈیوک'' یا ''نواب'' کے خطاب دے دیئے جاتے تھے اور ان خطابات کے ساتھ ہی انہیں عطا کردہ زمینوں سے ٹیکس وصول کرنے کا حق بھی مل جاتا تھا۔ آج بھی غیر منقولہ جائیداد (Real estate) سے حاصل ہونے والی آمدنی کو رینٹ ہی کا نام دیا جاتا ہے۔ رینٹ کا بنیادی پہلو یہی ہے کہ خطاب مرحمت ہوتے ہی بغیر کچھ کام کاج کئے آمدنی حاصل ہونا شروع ہو جاتی تھی۔ اور بغیر کسی کوشش یا محنت کے آمدنی کا حاصل ہو جانا ہی اس کی بنیادی خرابی شمار ہوتی ہے۔

جب سے انسانی معاشرے کی تنظیم ریاست کی صورت میں ہونا شروع ہوئی تب ہی سے لوگوں نے ریاست کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ وہ چنیدہ افراد کو رینٹ لینے کا اعزاز عطا کر سکتی ہے۔ کئی ایک رومانوی داستانیں بہادرانہ اور دلیرانہ کارناموں سے بھری پڑی ہیں جن کا انعام قلعوں اور جاگیروں کی صورت میں ہیرو کو عطا کیا جاتا ہے تاکہ وہ جاگیر کی زمینوں سے رینٹ (لگان) وصول کر کے عیش وعشرت کی زندگی بسر کر سکے۔ عام طور پر ان داستانوں میں ملر کا بیٹا شاہی دربار میں کوئی ایسا موقع حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے کہ وہ کوئی کارنامہ سرانجام دے سکے اور لگان وصول کرنے کی سہولت اسے عطا ہو جائے۔ چنانچہ ملر کا یہ بیٹا رینٹ سیکر (Rent Seeker) کا ابتدائی نمونہ ہی ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے رینٹ سیکر (Rent Seeker) ایسا شخص ہوتا ہے جس کی تمام کوششیں اسی مقصد کے حصول کے لئے صرف ہوتی ہیں کہ کسی طرح اسے رینٹ وصول کرنے کی سہولت میسر ہو جائے یا کسی قسم کی عطا کردہ سہولت مل جائے جس سے اسے بغیر محنت کئے آمدنی ملتی رہے۔ یہ تو سبھی کو علم ہے کہ ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنی ریٹائرمنٹ کے لئے کوئی ٹھکانہ بنا لے تاکہ بعد میں اسے دقت نہ ہو اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو رینٹ سیکنگ کو اس معمول کے برتاؤ سے ممتاز کرتی ہے؟ ایک شخص کافی محنت کرنے کے بعد بہت عرصے تک آہستہ آہستہ بچت کر کے کوئی

زمینی جائیداد خرید لیتا ہے یا اپنی رقم کی سرمایہ کاری کرتا ہے تا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اسے تھوڑی بہت آمدنی ہوتی رہے۔

رینٹ سیکر مذکورہ بالا شخص سے یوں مختلف ہے کہ رینٹ سیکر صرف یہی کام کرے گا کہ کسی طرح اسے رینٹ سیکنگ کا کوئی موقع ملے۔اس کے لئے عموماً وہ حکومت سے رجوع کرتا ہے اور اپنے تعلقات یا دوسرے ذرائع استعمال کر کے یا تو لائسنس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے یا پھر اجارہ دارانہ فوائد حاصل کرتا ہے تا کہ اسے رینٹ کی وصولی کا اختیار مل جائے۔اس کے لئے عموماً وہ کسی سرکاری اہلکار یا افسر سے رابطہ استوار کرتا ہے جو اسے نہ صرف ضروری معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ رینٹ وصول کرنے کے لئے ضروری اشیاء کے حصول میں بھی اس کی مدد کرتا ہے۔

اس سرگرمی کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ہرگز بارآور نہیں ہوتی بلکہ اس سے وسائل کا ضیاع اور ان کا غلط استعمال ہوتا ہے۔مثلاً غیر ضروری اور مہنگی حکومتی خریداری رینٹ کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔اس کا ایک اور نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اخراجات بڑھ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھا دیا جاتا ہے۔

رینٹ سکینگ کی وجوہات

جب ترقی پذیر ممالک نے آزادی حاصل کی تو مختلف شعبے مثلاً ترقیاتی منصوبے، غربت کا خاتمہ اور سماجی بہتری کے کام وغیرہ ریاست نے اپنی نگرانی میں لے لئے۔جب اس نے اتنا بڑا کردار خود ہی اپنا لیا تو اسے ملکی وسائل کے بڑے حصے پر خود بخود کنٹرول حاصل ہو گیا۔ترقیاتی کاموں کی منصوبہ بندی نے اسے ملکی وسائل پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کا مزید موقع فراہم کیا۔مزید یہ کہ وہی ایسا ادارہ تھا جسے ان وسائل کے استعمال کا کلی اختیار حاصل ہو گیا تھا۔ان وسائل پر اپنا کنٹرول مضبوط بنانے کے لئے لائسنسوں، کریڈٹ کنٹرول اور دیگر قواعد وضوابط تیار کر لئے گئے۔

معاشرے کے تمام طبقوں نے بڑھتی ہوئی ریاستی مشینری کو خوشحالی اور ترقی کے حصول کے لئے ضروری قرار دیا۔تبھی ریاست کو رینٹ وصول کرنے کے اختیارات کسی اور کو دینے کا حق حاصل ہو گیا۔ریاست عوام سے وسائل لے کر اپنے ہاتھوں میں انہیں مرکوز کر لیتی تھی اور بعد میں اپنے پسندیدہ افراد میں بانٹ دیتی۔وہ کھلے عام لائسنس، روٹ پرمٹ، ایجنسیاں اور قرضہ جات وغیرہ بغیر کچھ سوچے سمجھے دے دیا کرتی۔حکومت کے اسی رویئے نے ان رینٹ سیکرز کی حوصلہ افزائی

کی جوحکومت کی عنایات سے فائدہ اٹھانے کا فن جان گئے تھے اور اپنی جیبیں بھر رہے تھے۔

رینٹ سیکنگ کی سرگرمیاں

یہ ضروری نہیں کہ رینٹ سیکرز بیکار ہی بیٹھے رہتے ہوں دراصل کاروباری مواقع پیدا کرنے کے لےءانہیں خاصی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔اپنا ایک نیٹ ورک بنالینا یا تعلقات استوار کرنا تا کہ رینٹ سیکنگ کے مواقع میسر آ سکیں ایک لطیف فن ہے۔بعض بچوں کو تو ان کے بچپن ہی سے تربیت دی جاتی ہے اور یہ تربیت اس قدر سنجیدگی سے دی جاتی ہے کہ جیسے تعلیم سے بھی زیادہ اہم ہو۔بچوں کی پیدائش' شادیاں' عید' بسنت اور مرگ کے مواقع تعلقات بنانے کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں جن کو رینٹ سیکنگ کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔بہت سے برسوں سے اس طبقے کی اہم سرگرمی یہی رہی ہے کہ حکومت سے تعلقات استوار کر کے پیسہ اکٹھا کر لیں۔ان سرگرمیوں کے زمرے میں اثر ورسوخ کا ناجائز کاموں کے لئے استعمال' کرپشن اور حکومت کو اشیاء کی فروخت اور زیادہ قیمتوں پر حکومت سے ٹھیکے حاصل کرنا آتے ہیں۔

بہت اکثر پسندیدہ افراد کو سرکاری لائسنسوں کے ذریعے اجارہ داری قائم کرنے کا موقع فراہم کر دیا جاتا ہے۔اس ذریعے سے کئی افراد نے ٹیکسٹائل ملیں' شوگر ملیں' آئل ملیں اور روٹ پرمٹ حاصل کئے ہیں۔کئی مرتبہ تو یہ بھی ہوا کہ وہ کاغذ جس پر پرمٹ جاری کیا گیا اسے کافی زیادہ منافع پر فروخت کر دیا گیا۔

ایسے ایسے منصوبوں کے لئے آسان شرائط پر قرضے دیئے گئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ عموماً یہ منصوبے نامکمل رہ جاتے ہیں اور قرضوں کی باقی ماندہ رقم واپس نہیں ہوتی۔اور وہ بینک جنہیں ان رینٹ سیکرز کی سرگرمیوں کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کو کہا جاتا ہے دیوالیہ ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں اور انہیں عوام کے ٹیکسوں سے حیات نو فراہم کی جاتی ہے۔اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ لائسنس حاصل کرنے والے کو ٹیکس کی چھوٹ دی جاتی ہے مزید یہ کہ ترجیحی بنیادوں پر آسان شرائط پر قرضہ بھی فراہم کیا جاتا ہے۔اس طرح اس کا کاروبار مستحکم ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنی مقبوضہ منڈی میں من مانی قیمت وصول کرتا ہے کیونکہ اندرونی اور بیرونی مقابلے سے اسے مستثنیٰ حاصل ہے۔

رینٹ سیکنگ کے نقصانات

اصل مسئلہ یہ ہے کہ خواہ کیسی ہی کوشش کیوں نہ ہو یہ کاروبار بار آور نہیں اور اس سے ٹیکس دہندگان پر مزید بوجھ پڑتا ہے۔ ایسے ٹینڈروں کی کہانیاں عموماً گردش کرتے سنائی دیتی ہیں کہ مختلف رینٹ سیکرز نے کمیشن دے کر ٹینڈر کے پیسوں میں اضافہ کروالیا۔ اسی طرح چرب زبان مشیران ڈونر ایجنسیوں سے وابستہ ہو کر اپنا الو سیدھا کرنے لگے ہیں جبکہ پلاننگ کمیشن نجانے کونسے منصوبے بنا رہا ہے جو ابھی تک منظر عام تک نہیں آ پائے۔

رینٹ سیکنگ نے ریاست کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اب تو اتنی بڑی تعداد میں لوگ اس کام میں قدم رکھنے کے متمنی ہیں کہ کوئی اندازہ ہی نہیں۔ اور یہ لگتا ہے کہ جیسے یہاں اور کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ محنت سے کام کرنے والوں کو ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا بلکہ جب رینٹ سیکنگ میں ملوث لوگ بہت جلدی کامیابی کی منزل کو جا پہنچتے ہیں تو ان کی بہت حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ ان حالات نے نوجوانوں کو جو سبق دیا ہے وہ بھی یہی ہے انہیں بھی رینٹ سیکنگ کے منافع بخش کام کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور محنت اور ایمانداری میں کیا رکھا ہے۔

رینٹ سیکنگ کے خلاف اقدامات

بہت سے معاشرے رینٹ سیکنگ اور اس طرح کی دوسری غیر پیداواری اور غیر منافع بخش سرگرمیوں کو قانون سازی کے ذریعے محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعد میں اس بات کو بھی یقینی بناتے ہیں کہ بنائے گئے ان قوانین کو لاگو بھی کیا جائے۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں جاری قوانین کو امراء پر لاگو کرنے میں بہت دقت پیش آ رہی ہے۔ بالکل اسی طرح رینٹ سیکنگ میں ملوث امراء کے خلاف بھی ریاست بے بس سی دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے شاید قانون سازی اور قوانین کا نفاذ ایسی فضول سرگرمیوں کو موثر طور پر روک نہ پائے گا۔ تب ایک ترقی پذیر ملک میں کہ جہاں ریاست زوال پذیر ہو رہی ہو وہاں رینٹ سیکنگ کو کیسے محدود کیا جائے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے سب سے پہلے یہ نوٹ کرنا چاہئے کہ یہ سرگرمی محض حکومت کے معیشت میں حد سے بڑھے کردار کی وجہ سے پنپ رہی ہے۔ ضوابط، لائسنس دینا۔ قرضوں کو ترجیحی بنیادوں پر جاری کرنا۔ ٹیکسوں کی چھوٹ۔ اجارہ داریاں قائم کرنے کے ٹائٹل دینا وغیرہ رینٹس وغیرہ کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ حکومت کے بڑھتے ہوئے اخراجات سے رینٹ سیکرز فائدہ اٹھاتے ہیں اور پیسے کا غبن کر لیتے ہیں یا اس پیسے کا غلط استعمال کرنے لگتے ہیں۔ اس تمام مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ

ریاستی کردار کی دوبارہ سے تشریح کی جائے۔

حکومتی کنٹرول میں کمی' اشیاء اور خدمات کی پیدائش میں حکومت کے کردار میں کمی اور منڈی کی قوتوں پر زیادہ انحصار تمام افراد کو منڈی ہی کے رحم وکرم پر چھوڑ دے گا اور ان سب کو زندہ رہنے کے لئے کام کرنا پڑے گا۔ اور گھریلو منڈی میں مقابلے کے لئے صف آراء ہونے والی قوتیں اور گھریلو صنعتوں کو بیرونی مقابلے پر مجبور کر کے معیشت کے میدان میں اہلیت کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک ایسا صنعتکار جو اندرونی اور بیرونی منڈیوں میں مقابلے کی اشیاء پیدا کر کے بھیجتا ہو رینٹ سیکنگ جیسے غیر پیداواری کام کے خاتمے کا مطالبہ کرے گا کیونکہ یہ محض اس پر ٹیکس کا بوجھ بڑھانے ہی کا سبب بنتا ہے جس کا تمام صنعتوں سے وابستہ افراد کو نقصان ہوتا ہے۔

(27)

کچھ قیمت سے متعلق

جب میں پچھلی مرتبہ پاکستان آیا تو میں نے ایک بہت بڑے سیمینار میں شرکت کی جسے بڑے اہتمام سے منظّم کیا گیا تھا یہ سیمینار ''پاکستان میں معاشی پالیسی اور معاشی ترقی'' کے موضوع پر تھا۔اس سیمینار میں بہت سے معروف لوگوں نے شرکت کی۔وزیرخزانہ نے اس کا افتتاح کیا اور مختلف وزراء اور دیگر اہم شخصیات نے اس کے مختلف سیشنوں کی صدارت کی۔اہم شخصیات اتنی بڑی تعداد میں وہاں جا پہنچیں کہ منتظمین کو سٹیج پر اضافی کرسیاں رکھنی پڑیں اور ان شرکاء کے اطمینان قلب کے لئے ہر ایک کو ''چیئرمین'' بنانا پڑا ان اہم شخصیات کی پذیرائی کے لئے خوش آمدید کہنے کے لئے خصوصی تقاریر کی گئیں اور تقریب کو کئی مرتبہ روکنا پڑا۔ یہ سب کچھ ٹیلی ویژن اور اخبارات میں نمایاں طور پر پیش کیا گیا منتظمین اور شرکاء میڈیا میں جگہ پا لینے پر بہت خوش تھے۔اور شاید سیمینار کا مقصد بھی یہی تھا جو پورا ہوگیا۔جس میں منتظمین اور شرکاء کی نہ صرف پروجیکشن ہوئی بلکہ ان کا مستقبل بھی سنور گیا۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ سیمینار میں ہونے والی زیادہ تر گفتگو محض فرسودہ اور عامیانہ تھی۔ مسائل جن کا ذکر کیا گیا ان پر کسی قسم کی تحقیق نہ کی گئی تھی نہ ہی کوئی ثبوت پیش کئے گئے اور نہ ہی کوئی نئے نظریات یا تھیوری پیش کی گئی۔ نہ بحث مباحثہ ہوا صرف تقاریر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا اور بس! لیکن تمام منتظمین اور شرکاء بہت خوش تھے کیونکہ ان کی تصاویر اخبارات میں چھپ رہی تھیں اور ان کی شہ سرخیوں میں ان کا نام آ رہا تھا اور یہی چیزیں ان کا مستقبل استوار کرنے کیلئے ضروری تھیں۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ سیمینار معاشیات پر تھا لیکن گفتگو زیادہ تر معاشیات کے علاوہ موضوعات پر ہوئی۔تمام تر کارروائی کے دوران ''لفظ'' ''قیمت'' ایک مرتبہ بھی نہ بولا گیا حالانکہ معاشیات کا سب سے زیادہ تعلق ''قیمت'' سے ہے لیکن سیمینار جو تین دن تک جاری رہا ''قیمت'' کا لفظ ایک مرتبہ بھی استعمال نہ آیا معاشیات میں ''قیمت'' رسد کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ اشیاء

کو پیدا کرنے والا قیمت ہی کو مدنظر رکھ کر اشیاء فروخت کرنے منڈی لاتا ہے۔ سرمایہ کار بھی ''قیمت'' ہی کو پیش نظر رکھ کر سرمایہ لگاتا ہے اور خریدار قیمت کو ہی دیکھ کر خریداری کا ارادہ باندھتا ہے۔

دنیا بھر کے معاشیات دان ''قیمت'' کے اس اہم کردار کو مانتے ہیں۔ معاشیات دان یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ رسد بڑھ جاتی اور طلب کم ہو جاتی ہے اگر قیمت میں اضافہ ہو جائے تو' خریدار یہ کوشش کرتے ہیں کہ کم قیمت کی اشیاء خریدیں اور اشیاء پیدا کرنے والا چاہتا ہے کہ ان اشیاء میں سرمایہ لگائے جن کی قیمت زیادہ ہو اوور منافع کا امکان بھی زیادہ ہو۔ معاشیات دان یہ بات بھی مانتے ہیں کہ ایسا پہلو (وجہ) جو اشیاء کی اضافی قیمت پر اثر انداز ہو تو اس کا اثر خریدار اور اشیاء کے پیدا کرنے والے دونوں کے فیصلوں پر پڑتا ہے۔ حکومت مداخلت مثلاً ٹیکس وغیرہ نافذ کر دینا منڈی کی قوتوں کے ذریعے سے متعین ہونے والی اشیاء کی اضافی قیمتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس طرح کی مداخلت کے نتیجے میں معاشی فیصلے پھر منڈی نہیں بلکہ بیوروکریٹ کرتے ہیں۔

''قیمت'' کے معیشت میں اس کردار کے باعث دنیا بھر کے معاشیات دان پالیسی بناتے ہوئے اس بات کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ اس پالیسی کا معیشت میں ''قیمت'' کے ڈھانچے (Price Structure) پر کیا اثر پڑے گا۔ اچھی معاشیات دراصل پالیسی کے ذریعے قیمت کو متاثر کرنے کو صحیح قرار نہیں دیتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ تر قدر زائد اور سیلز ٹیکس جیسے اقدامات پر زور دیا جاتا ہے جو کہ اشیاء کی منڈی میں اضافی قیمتوں کو مستحکم رکھتے ہیں۔ اس طرح کے اقدامات جیسے ٹیلی فون کالوں پر 60 فیصد ایکسائز ڈیوٹی' دیگر ڈیوٹیز یا کسی خاص شے پر ٹیکس عائد کر دینا محض اس لئے کہ آمدنی کو بڑھایا جا سکے یہ اقدامات نہ صرف اضافی قیمتوں کو متاثر کرتے ہیں بلکہ اچھی معاشیات اور معاشیات دانوں میں بھی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے۔ قیمتوں کے ڈھانچے کی اہمیت کو تسلیم کر کے ہم ایک فریم ورک تشکیل دے سکتے ہیں جس کے اندر رہتے ہوئے کام کیا جا سکتا ہے۔ اگر قیمت کے نظریئے کا یہ فریم ورک موجود ہو تو من مانی پالیسی کی سفارشات سے بچا جا سکتا ہے۔ تمام سفارشات کو منڈی کے قوانین میں کم سے کم دخل اندازی دینے کا عہد کرنا ہوگا اور منڈی کی جانب سے متعین کردہ قیمتوں کے ڈھانچے کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔

بدقسمتی سے سیمینار کے شرکاء نے قیمت یا معاشی تھیوری میں دیئے گئے فریم ورک کو خاطر میں لانے سے انکار کر دیا۔ شروع ہی سے مقرر اپنی پسند کے موضوعات پر لمبی لمبی تقاریر کرنے میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے جو بھی سفارشات پیش کیں وہ معاشی تھیوری یا فریم ورک سے قطعاً

میل نہ کھاتی تھیں۔ اگر مقرر کے ذہن میں شہر کی سیر کرنے کا خیال آ گیا تو اس نے حکومت کو ایک کارپوریشن بنانے کی تجویز دے دی تا کہ اس کے گھر کے قریب سے ٹرانسپورٹ مہیا ہو جائے پھر اس نے کارپوریشن کے لئے فنڈ کی فراہمی کے بارے میں تجاویز دینا شروع کر دیں کہ اسے یا تو قرض لینا چاہئے یا آمدنی کسی اور طرح سے بڑھانی چاہئے۔ انہیں اس سے کوئی واسطہ نہ تھا کہ کس کو ٹیکس لگے گا اور کتنا ٹیکس لگے گا۔

سیمینار کے ذریعے شرکاء نے ٹیکسوں میں اضافے کی 65 تجاویز دیں جو کہ منڈی کی جانب سے دیئے جانے والی قیمتوں کے ڈھانچے کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ علاوہ ازیں اخراجات میں 10 فیصد اضافہ بھی تجویز کیا گیا کئی حکومتی تنظیمیں اور محکمے قائم کرنے کی پرزور سفارش کی گئی۔ ان علم و فضل سے لدے ہوئے حضرات نے یہ سفارش بھی کی کہ پہلے سے قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہماری معیشت کو خسارہ کی دلدل میں دھکیل دو اور ایسا کرتے ہوئے وہ اس حقیقت سے چشم پوشی کر رہے تھے کہ اس سے قرضوں کا بوجھ اور بڑھے گا پھر افراط زر کی مصیبت آن دھمکے گی اور بڑھتے ہوئے کرنٹ اکاؤنٹ اور ایکسچینج ریٹ کی مشکلات میں بھی اضافہ ہوگا۔

انہیں اس بات کی بھی خبر نہ تھی کہ قیمتوں کے ڈھانچے میں دخل اندازی کے کیا مضمرات ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے پیداواری عمل کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے۔ انہیں اس کی بھی پرواہ نہ تھی کہ ٹیکسوں میں اضافے سے کام کرنے اور عمل پیدائش کے ذمہ دار لوگوں کی کتنی حوصلہ شکنی ہوگی اور ایسی پالیسیوں کے نتیجے میں معاشی ترقی کا عمل سست روی کا شکار ہو جائے گا۔ ان تمام امکانات سے بے خبر وہ اپنی لمبی لمبی تقریروں میں نجانے اور کیا کچھ تجویز کرتے رہے جن کا اکنامک تھیوری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ غالباً وہ بالکل آزاد تھے ہر طرح کی معاشی تھیوری یا معاشیات کے شعبے سے ہی!

مجھے امید ہے کہ یہ سیمینار محض میڈیا گمگ ہی رہا ہوگا اور اس سے صرف ہوٹل والوں کو ہی فائدہ پہنچا ہوگا جس میں یہ منعقد کیا گیا تھا۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے پالیسی ساز اس سیمینار میں پیش کی گئی سفارشات کو سنجیدگی سے نہیں لیں گے اگر ان انسانی علم کی سرحدوں سے آزاد لوگوں کی مضحکہ خیز باتوں کو سنجیدگی سے لیا گیا اور انہیں نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو مجھے یہ سوچ کر ہی خوف آنے لگتا ہے کہ ہماری معیشت کا کیا حال ہوگا۔

(د) اصلاح کیلئے امکانات

(28)

اصلاحات پر ایک معلوماتی مباحثے کی ضرورت:

حالات کی ابتری کا جائزہ

پاکستان میں سیاسی نظام یکدم جمود کا شکار ہو گیا ہے ہم سب سانس روکے موقع پرستی' طاقت کے حصول کے لئے کشمکش' سیاسی وفاداریوں میں تبدیلی اور بیوروکریٹس کی سازشوں کا ڈرامہ دیکھ رہے ہیں جس کے وہی پرانے کردار آج بھی پورے انہماک سے ساری دنیا کو تماشا دکھانے میں مصروف ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا ہمیں اسی راستے پر چلتے رہنا چاہئے جس پر ہم پچھلے 49 برسوں سے چل رہے ہیں یا پھر ہمیں بنیادی اور دور رس اصلاحات کا راستہ اپنا لینا چاہئے۔جن سے سیاسی نظام اور اس سے متعلقہ اداروں میں مثبت تبدیلی آ جائے اور پاکستان میں ذمہ دار اور جمہوری حکومت کا قیام ممکن ہو سکے۔اس مضمون میں میں نے انہی حالات اور امکانات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت جب سیاستدان' بیوروکریٹ اور ہمارے دیگر صاحبان اقتدار اپنی اپنی کھیلوں میں مصروف ہیں' پاکستانی معیشت کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔اور خیال یہی ہے کہ معاشی ترقی کی رفتار اور سست ہو جائے گی جبکہ افراط زر کی شرح بہت بڑھنے کی قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔حالانکہ حکومت پر قرضے کا بوجھ انتہا کو جا پہنچا ہے پھر بھی مالیاتی خسارے کو کم کرنے کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی۔ ہمارے ہاں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس کا زیادہ بڑا حصہ بڑے شہروں میں آ کر آباد ہو رہا ہے۔ہم ابھی تک اس بڑھتی ہوئی آبادی کو سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر ہیں اور ساتھ ہی کسی بھی فن سے نابلد اور ان پڑھ مزدوروں کو روزگار بھی فراہم نہیں کر پائے۔غلط پالیسیوں

اور ماضی کی زیادتیوں نے اب اپنا آپ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ معاشی ترقی کے لئے ضروری بنیادی وسائل ابھی تک مہیا نہیں ہو سکے۔ ہمارے پاس بہت محدود اور قدیم زمانے کے ذرائع رسل ورسائل ہیں۔ انسانی سرمائے (Human Capital) کو ترقی دینے کے لئے ہمارے پاس سہولتوں کا شدید فقدان ہے جس کو ترقی دینا معاشی ترقی کے لئے بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس ایک بھی اعلیٰ پائے کا تعلیمی ادارہ موجود نہیں۔

ریاست کی عمومی حالت خاصی ناگفتہ بہ ہو چکی ہے ہر طرف بے بسی کا سماں ہے اور تمام سیاسی وسماجی ادارے تباہی کے دہانے تک جا پہنچے ہیں۔ ریاست شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے قابل نہیں رہی اور نہ ہی معاشرے کے اراکین کو سہولت فراہم کرنے کی اس میں کوئی سکت باقی ہے۔ شہریوں کی حتیٰ کہ جان و مال بھی محفوظ نہیں۔ ہماری عدالتیں، ہمارے شہر، ہمارا ٹریفک کا نظام، پانی اور بجلی کی فراہمی غرضیکہ ہر شعبہ تعطل اور نااہلی کا شکار ہے۔ لیکن ہمارے بیوروکریٹ اور سرکاری عہدوں پر متمکن لوگ اپنے سابقہ نوآبادیاتی آقاؤں سے بھی زیادہ طاقت اور شان وشوکت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جواب دہی اور ذمہ داری کی سطح زمین کی پاتال کو چھونے لگی ہے۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم بیوروکریٹوں، ظالم حکمرانوں اور انتشار کے زمانے میں جی رہے ہیں۔

ابتری سے بھرپور صورتحال میں ہمارے سیاستدان ایسا لگتا ہے بے فکری سے کھیل کھیلنے میں مصروف ہوں۔ ہمارے صدر موصوف (غلام اسحاق خان) جو دراصل ایک بیوروکریٹ ہیں اور 25 برس تک معیشت پر کنٹرول کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہر اس تبدیلی کی مزاحمت کی تاکہ سٹیٹس کو کوئی گزند نہ پہنچ پائے۔ اس لئے انہوں نے مرکزی بیوروکریٹک نظام کا بڑی پامردی سے دفاع کیا۔ اب اگرچہ نواز شریف نے چند ایسے اقدامات کئے ہیں جن کی اشد ضرورت تھی لیکن سیاسی مباحثہ ابھی تک شخصیتوں تک ہی محدود ہے اور کوئی معاشرے کو درپیش مسائل کی بات نہیں کرتا۔ سیاستدان وزارتوں کے حصول کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ اور ان مسائل سے انہیں کوئی سروکار نہیں جن کا براہ راست ہماری معیشت یا معاشرت سے تعلق ہے۔ مذکورہ بالا امور میں ملوث ہو کر سنجیدہ کام کرنے کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں بچتا۔ انہیں کچھ سیکھنے یا ایسا بامقصد کام کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں جو آگے چل کر ان کے اپنے لئے اور قوم کے لئے مفید ثابت ہو۔

ہم سب اس مرحلے تک جا پہنچے ہیں جہاں ہم سیاسی ڈرامے میں بری طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ سیاستدان اکثر و بیشتر احمقانہ اور بچگانہ پریس کانفرنسیں کرتے ہیں جن میں کوئی کام کی بات

ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی اور ان پریس کانفرنسوں کے لئے انہوں نے مناسب تیاری بھی نہیں کی ہوتی پھر بھی اخبارات کی شہ سرخیوں میں ان کے بیانات کو جگہ دی جاتی ہے اور بڑے بڑے فوٹو بھی چھپ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان اخبارات کے مالکان سیاستدانوں کے گہرے دوست ہوتے ہیں اور یہ گہرے دوست کبھی کبھار اپنے سیاستدان دوستوں کے لئے اداریے بھی تحریر کر دیتے ہیں بے شک سیاستدان موصوف حماقت کا منہ بولتا ثبوت ہی کیوں نہ ہوں۔ جب میڈیا اس طرح کام کرے کہ شہ سرخیوں میں لوگوں کو جگہ ان کی سماجی و سیاسی حیثیت کو دیکھتے ہوئے دے اور میرٹ یا دیگر خوبیوں کے حامل لوگوں کو اخبارات کی پذیرائی حاصل نہ ہو سکے تو مباحثہ یا تعمیری بات کا ہونا ممکن نہیں رہتا۔

ہر صبح ہمیں اخبارات میں تجزیوں کی نہ ختم ہونے والی یلغار کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن میں عام طور پر ''لانگ مارچ'' ''آٹھویں ترمیم'' اور ''صدر کے انتخاب'' وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے گنا کہ 187 اداریے صرف لانگ مارچ پر انگریزی اخباروں میں لکھے گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے صف اول کے دانشور سیاست کے میدان کے مضحکہ خیز کرتبوں پر قیاس آرائیاں کرنے میں ہی مصروف رہتے ہیں۔ اخبارات میں اداریوں اور دوسرے مضامین میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں ان سب کا ذریعہ یا تو افواہ ہوتا ہے یا قیاس آرائی!

سیاستدان دانشوروں کے اس رویے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ اس تمام تر توجہ سے جو کہ انہیں اخبارات اور میڈیا کے دوسرے ذرائع سے ملتی ہے نہایت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کے احمقانہ بیانات تواتر کے ساتھ اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں لہذا وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں جیسے انہیں سب کچھ معلوم ہے۔ اس لئے ان پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہوتا کہ وہ مزید جاننے، تفتیش کرنے، پڑھنے یا ملک کو درپیش مسائل پر تحقیق کرنے کی زحمت کریں بلکہ وہ ٹرائیکا کی سیاست حکمت عملی، باہر کی دنیا میں ہونے والی پیش رفت اور اسلامائزیشن جیسے غیر متعلقہ موضوعات پر بحث کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نہ ہی ہمیں بنیادی مسائل پر جو کہ معیشت و معاشرت سے متعلق ہوتے ہیں لب کشائی کی اجازت ہوتی ہے۔ حماقت کی اس ریت کو سیاست دان ایڈیٹرز اور ہمارے صف اول کے دانشور مل کر مستحکم کرتے ہیں اور ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ عوام کو اصل مسائل کا علم ہی نہ ہو۔

اتنی بڑی تعداد میں مسائل کے ہوتے ہوئے حالات اسی ڈگر پر زیادہ دیر تک چل نہیں سکتے یہ چکر ہمیں تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ریاست کے طور پر بھوکے ننگے نظر آتے ہیں جو کوئی بھی

کام صحیح طرح سے کرنے کے قابل نہیں اور ساری دنیا ہمیں دہشت گرد ملک کہہ رہی ہے۔ اندرونی طور پر ریاست جمود کا شکار ہوگئی ہے اب تو یہ شہریوں کی جاں و مال کی بھی حفاظت کرنے کے قابل نہیں اور جو کچھ قانون پہلے کبھی تھا اب تو وہ بھی نہیں رہا۔ مالی خرد برد زندگی گزارنے کا ایک طریقہ بن گیا ہے۔ مالی خرد برد اور افسران کی رشوت کی وجہ سے حکومت پر قرض کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے ممکن ہے اب بہت ہی اونچی سطح کا افراط زر آن دھمکے۔

اصلاحات کی ضرورت

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ترقی کے لئے ہمیں موجودہ نظام میں اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں ذمہ دار اور لوگوں سے ہمدردی رکھنے والی حکومت قائم کرنے کیلئے نئے نظریات کو ترویج دینا ہوگا۔ میڈیا کو نئی ترغیبات دینے بھی اصلاحات لازمی ہیں تاکہ وہ افراد کی بجائے قومی مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کرے نہ کہ سیاستدانوں اور پارٹی عہدیداروں کے احمقانہ بیانات ہی کو اہمیت دیتا رہے۔ اس کے لئے بھی اصلاحات کی بہت ضروت ہے کہ حکومت عوام کی حالت بہتر بنانے کو اپنا اولین مقصد سمجھنے لگے۔ اس کے لئے ہم سب کو بشمول حکومت اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کو تنقیدی انداز سے جانچنا چاہئے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ضروری تبدیلیاں کرتے رہنا چاہیں۔ ان تمام مسائل پر کھلے عام بات چیت اور تحقیق کا ہونا اشد ضروری ہے۔

اس مضمون کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اگر ممکن ہو تو ملک میں بحث و مباحثہ یا بات چیت شروع کی جائے۔ اب وقت ہے کہ مفکر، محقق اور ایسے لوگ جنہوں نے محنت کر کے معلومات یا فکر کو پروان چڑھایا ہے انہیں آگے آ کر اپنے افکار و نظریات کو پیش کر دینا چاہئے۔ ہم نے کافی عرصے تک ضمیر فروش سیاستدانوں، بیوروکریٹوں اور حکومت کے مقرر کردہ افراد کو یہ اجازت دے رکھی تھی کہ وہ ہمارے لئے سمت کا تعین کریں۔ وقتاً فوقتاً یہ لوگ جذباتی اور بے معنی نعرے تو لگاتے رہے مثلاً اسلامائزیشن، روٹی کپڑا اور مکان، بنیادی ضرورتوں کی فراہمی اور پانچ نکات کو پروگرام کے طور پر یہ لوگ پیش کرتے رہے لیکن ان پر انہوں نے صحیح طور سے تحقیق کی نہ سوچ بچار کی۔ آج بھی پورا ملک حکومت ہی کے مجوزہ پروگرام پر بحث و تمحیص کرنے میں لگا ہوا ہے۔ حکومت کے تجویز کردہ پروگرام جو بظاہر معاشی ترقی کیلئے بنائے جاتے ہیں ان پر بھاری اخراجات ہو جانا معمول کی بات ہے۔ ان بھاری اخراجات سے بہت سے افراد کو فائدہ ہوتا ہے۔ البتہ ترقی بہت معمولی ہوتی ہے۔ دراصل اسی عمل میں ہم چند اداروں کو تباہ کر دیتے ہیں اور قرض کے بوجھ میں اضافہ ہو جاتا ہے جسے سارے

ملک کوادا کرنا پڑتا ہے۔

اب ہمیں حکومت یا اس کے اہلکاروں کا پیچھا چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ تو واضح ہو ہی چکا ہے کہ 21ویں صدی میں ایک مضبوط اور خوشحال قوم کی حیثیت سے داخل ہونے کے لئے اصلاحات کی ضرورت ہے ورنہ ہماری بقاء خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہم حکومت اور اس کے اہلکاروں اور افسروں کا انتظار کرتے رہے کہ وہ ہمارے لئے اصلاحات کا خاکہ بھی بنائیں گے اور انہیں نافذ بھی کریں گے تو اس سے وقت اور وسائل کے ضیاع کے علاوہ ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہم سب کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جنہوں نے ملکی وسائل پر غور غوض کرنے پر وقت صرف کیا ہے انہیں آگے آنا چاہئے اور اپنے نظریات کو بحث و مباحثے کے لئے پیش کرنا چاہئے۔ بدقسمتی سے کسی فورم کے نہ ہونے اور ایسے افراد میں تعاون کے فقدان کے باعث کیوں کہ بعض افراد کو حکومت کی طرف سے بھی ترغیبات ملتی ہیں ایسی بحث کا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اس مضمون میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ سنجیدہ ماہرین علم، مصنفین اور محققین کو دعوت دی جائے کہ وہ اپنے افکار اور نظریات جو کہ معاشی ترقی اور اصلاحات سے متعلق ہوں پیش کریں تا کہ سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کو سلجھانے میں کسی قسم کی پیش رفت ممکن ہو سکے۔

تحقیق اور اصلاحات کے لئے ایجنڈا

یوں تو بہت سی کانفرنسیں، بحثیں اور تحریریں منظر عام پر آتی رہتی ہیں لیکن تحقیق اور اصلاحات کیلئے کوئی مربوط ایجنڈا مہیا نہیں ہو سکا۔ اس مضمون میں چند بہت اہم محققین کی تحریروں پر غور کرنے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اصلاحات کے لئے ابتدائی نوعیت کا ایجنڈا تیار کیا جا سکے گا۔ یہ ایجنڈا ان مسائل کو جامع انداز میں حل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا جو اس سے متعلق ہیں۔ اگرچہ تجویز کئے گئے مسائل کے حل اور دیگر تجاویز آخری اور قطعی نوعیت کی تو نہ ہوں گی لیکن ان تمام افکار اور تجاویز آئندہ کے لئے تحقیق کے موضوعات کے طور پر بہت اہمیت ہوگی۔

1- سیاسی اور آئینی اصلاحات

تمام سیاستدان اور سیاسی پارٹیاں سیاسی اصلاحات کی ضرورت کو تسلیم کرتی ہیں۔ کچھ عرصے پہلے ''نئے سماجی معاہدے'' کے بارے میں بھی کافی گفتگو ہوتی رہی لیکن اس کے تصور کی کسی

نے تعریف کرنے کا تکلف گوارا نہیں کیا۔ بہت سے سیاستدانوں نے بمع ہمارے صدر کے متناسب نمائندگی کے امکان کا بھی ذکر کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے دانشوروں اور ماہرین علم نے اس ضمن میں کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ ہمارے سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں پر ایسی کوئی بندش نہیں جس کے تحت انہیں معاشرے کے مفاد کے خلاف کوئی کام کرنے سے روکا جا سکے۔

پارلیمینٹرین حضرات۔ سیاستدان اور دیگر اہم لوگ ہمارے موجودہ نظام میں پیداواری کام کرنے کے علاوہ باقی ہر کام کر رہے ہیں چنانچہ ہر طرف کرپشن اور بدانتظامی کا دور دورہ ہے۔

2- سول سروس میں اصلاحات

ہمارے وسائل زیادہ تر بیوروکریٹس کی تحویل میں ہوتے ہیں جو ایک ایسے نظام کے اندر رہتے ہوئے کام کر رہے ہیں جو نوآبادیاتی دور کی یادگار ہے۔ تقریباً تمام لوگ اس پر متفق ہیں کہ یہ نظام بالکل ناکارہ ہو گیا ہے اس کے باوجود اس پر کوئی بات چیت نہیں ہوتی۔ حالانکہ سول سروس کے ملازمین کو ملنے والی تنخواہ، ترغیبات، ذریعہ آمدورفت کی سہولت اور ان کی ذمہ داریوں پر اب نظر ثانی کی جانی چاہئے۔ سول سروس میں بھرتی کرتے وقت یہ دیکھنا چاہئے کہ امیدوار کی تعلیم نوکری کی ضروریات کے مطابق ہے یا نہیں نیز اس کے پاس اگر اس سے پہلے کسی نوکری کا تجربہ ہے تو کیا یہ تجربہ سول سروس میں امیدوار کے لئے مددگار ثابت ہوگا یا نہیں۔ سرکاری شعبہ میں اصلاحات کی تجاویز میں تنخواہوں، دیگر سہولتوں اور ریٹائرمنٹ پر دیئے جانے والے پیسوں کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہوگا تاکہ یہ شعبہ اچھے اور قابل امیدواروں کے لئے کشش کا باعث ہو۔

لیٹرل اینٹری (Lateral entry) جمہوریت کی طرح جبھی جڑیں پکڑ سکتی ہے اگر اس کا زیادہ استعمال کیا جائے۔ بیرونی مقابلے کے خوف کے بغیر سول سروس کی اہلیت میں اضافہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ سول سروس میں آنا اور اس سے جانا سہل ہو اس سہولت کے ساتھ ساتھ ہمیں ترغیبات پر بھی غور کرنا پڑے گا۔ اگر یہ سب کچھ ممکن ہو جائے تو سول سروس میں ترقی جلد ہو سکے گی۔ تنخواہیں بڑھ جائیں گی اور بہترین صلاحیتوں سے مرصع لوگ اس سروس میں شمولیت اختیار کریں گے۔

3- قانون سے متعلق اصلاحات

ریاست کا بنیادی فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان کی صورتحال کو یقینی بنائے اور افراد کے باہمی اختلافات کو پرامن طریقے سے سلجھائے۔ پاکستان میں عدالتیں اور پولیس کا نظام بہت فرسودہ ہو چکا ہے۔ جس کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ ایک آزاد اور پیشہ وارانہ مہارت رکھنے والا عدالتی نظام معیشت اور معاشرے کو سدھارنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں بہت معاون ہوگا۔ ایسے عدالتی نظام کو قانون نافذ کرنے والے اہل اور جامع نظام کی مدد بھی حاصل ہونی چاہئے۔

4-عدم مرکزیت (Decentralization)

عدم مرکزیت کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کسی بھی ملک میں ہونے والی اصلاحات کا سب سے اہم پہلو ہوتا ہے۔ عدم مرکزیت کے بارے میں باتیں تو بہت ہوتی رہی ہیں مگر اس کی صحیح اور جامع تعریف ابھی تک نہیں کی گئی۔ عدم مرکزیت کا حصول تبھی ممکن ہوسکتا ہے۔ اگر مقامی کونسلوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے خاص طور پر منصوبہ بندی اور اخراجات کے معاملات میں! مقامی کونسلوں کے فیصلوں کو صوبائی اور مرکزی سطح پر منسوخ نہ کیا جاسکے جیسا کہ آجکل کے نظام میں ہوتا۔ ایک مکمل مرکز گریز نظام میں محض وزارتوں کا قیام یا لوکل گورنمنٹ کے دائرہ اختیار میں آنے والے شعبہ جات کے الگ محکمے قائم کرلینا عدم مرکزیت کے خلاف ایک قدم ہوگا اور ایسا کرنے سے خواہ مخواہ پیسہ بھی ضائع ہوگا۔

ان علاقوں میں جہاں مرکز گریز نظام رائج ہو انہیں یہ فیصلہ کرنے کی بھی آزادی ہونی چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ وسائل کے حصول کے لئے انہیں کونسی اشیاء پیدا کرنی چاہیں اس طرح وہ ایسی اشیاء پیدا کرسکیں گے جن کی پیدائش پر ان مخصوص علاقوں میں لاگت کم آتی ہو۔ ہمارے ملک میں تمام ریاستی ملازمین کو ایک ہی ''نیشنل پے سکیل سسٹم'' میں جکڑ دیا گیا ہے جس کے تحت مرکزی حکومت کے ملازمین کو سرفہرست رکھا گیا ہے جبکہ لوکل گورنمنٹ سروس کے ملازمین سب سے نیچے آتے ہیں جو سراسر عدم مرکزیت کے خلاف ایک عمل ہے۔ اسی طرح منصوبہ جات کا ٹارگٹ معین کرنا اور مرکزی یا صوبائی سطح پر ترجیحات کا طے کرلیا جانا بھی مقامی سطح پر فیصلہ کرنے کی حوصلہ شکنی کرنے کا موجب بنتا ہے۔

5-مالیاتی اصلاحات

مالیاتی شعبہ چھوٹے بچت کرنے والوں کی رقوم کو پیداواری عمل کو بڑھانے کے لئے سرمایہ کاری میں استعمال کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔اس کے نتیجے میں ترقیاتی عمل تیز ہوتا ہے۔بدقسمتی سے مالیاتی منڈیوں پر سرکاری شعبے کے غلبے کی وجہ سے قومیائے گئے بینک اور سرکاری شعبے میں قائم کی گئی مالیاتی کارپوریشنیں وجود میں آ گئیں اور سیاسی سرپرستی کا ذریعہ بن گئیں۔متواتر وقوع پذیر ہونے والی مالیاتی بے ضابطگیوں میں لوگوں کو لوٹا جاتا رہا اور کسی پر کوئی فرد جرم عائد نہ ہوئی۔بڑے بڑے صنعتی اور مالیاتی ادارے کھاتے داروں کے مفاد میں کبھی کام نہیں کرتے ان کی نظریں ہر پل ہر لمحہ حکومت پر لگی رہتی ہیں جو کہ انہیں بین الاقوامی اور ملکی دونوں طرح کے مقابلے سے محفوظ رکھتی ہے۔مالیاتی بے ضابطگیوں کے باوجود ان کمپنیوں کو حکومت کی طرف سے قرض ملتا رہتا ہے تاکہ یہ کھاتے داروں کو جوابدہی سے بچ سکیں۔دراصل مالیاتی منڈی کی اصلاحات جو کہ ہر ایک کو منڈی کے نظم وضبط (Market Discipline) کے تابع لاسکیں یہی اصلاحات تمام مفادات کی حفاظت کی ضامن بن سکتی ہیں۔اس مقصد کے لئے قواعد وضوابط کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہئے اس پر بات چیت اور بحث ومباحثہ کی ضرورت ہے۔

6- تعلیمی اصلاحات

ہمارا تعلیمی نظام انتہائی بے راہروی میں پھنس کر رہ گیا ہے۔اس نظام نے کافی سارے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی سوائے اچھے معیار کی تعلیم کی فراہمی کے!اس نے محبّ وطن اور قوم پرست پاکستانیوں کو پیدا کرنے کی کوشش کی جو کہ اچھے مسلمان اور پان اسلام ازم کے شیدائی ہوں! تعلیمی نظام کو سیاسی جماعتوں کے لئے کارکن پیدا کرنے والے ذریعے کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ یہ ایسا شعبہ ہے جس کے بارے میں ہمیں سب سے کم فکر ہے اور ہمارے سیاستدانوں اور بیوروکریٹوں کو اس سے بھی کم!ان حضرات نے تو ہر تبدیلی کی بڑے زور وشور سے مخالفت کی۔جب ہمارا تعلیمی نظام اچھے تعلیم یافتہ افراد پیدا نہیں کرے گا جن میں پیداواری کام کرنے کی بہترین صلاحیت ہو۔اصلاحات کی کوئی بھی کوشش بارآور ثابت نہیں ہوسکے گی۔

نتیجہ

یہ مضمون ان تمام افراد کو کہ جنہوں نے پاکستان کی معیشت، سیاست اور معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اور سوچا سمجھا ہے اپنی تجاویز اور افکار پیش کرنے کی دعوت دینے کیلئے تحریر کیا گیا ہے۔ ان حضرات کا مضمون تجزیاتی تجرباتی مثالوں اور عملی تجاویز پر مبنی ہونا چاہئے۔ ان حضرات کو ذاتی نوعیت کے بیانات قیاس آرائیوں اور افواہوں سے گریز کرنا چاہئے حالانکہ پاکستان کی صحافت اور دانشوری میں ان چیزوں کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے مصنفین کو بے جا اصطلاحات سے بھی گریز کرنا چاہئے تا کہ عام قاری ان کی تحریروں سے استفادہ کر سکے۔ جب ہم سب کو (ان قارئین کے بشمول جو یہ مضمون پڑھ چکے ہیں) ان مسائل پر غور و فکر اور بات چیت کرنی چاہئے اور ان کے متعلق لکھنا بھی چاہئے ورنہ ہم ان نالائق اور کرپٹ سیاستدانوں بیوروکریٹوں اور رہنماؤں کے ہی پیچھے لگے رہیں گے؟

(29)

کابینہ کے حجم کو کم کرو!

ایک مرتبہ پھر مشاہدے میں آیا ہے کہ جوں جوں حکومت کا عہدا قتدار طول اختیار کرتا جا رہا ہے توں توں کابینہ بھی وسعت اختیار کرتی جارہی ہے یعنی پرانی روایات پھر سے زندہ ہورہی ہیں۔ وہ لوگ جن میں نہ تو صلاحیت ہے اور وہ میرٹ پر بھی پورے نہیں اترتے انہیں وزارتوں اور عہدوں سے نوازا جارہا ہے۔ یہ لوگ قانون سازی اور انتظامی امور سے مطلقاً نابلد ہیں۔ ہر حکومت میں ان حضرات کو عہدے دیئے جاتے رہے ہیں لیکن ان میں ان عہدوں کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت ہی نہیں چنانچہ عہدے ملنے پر ان حضرات نے ملک کی تو کوئی خدمت نہیں البتہ اپنی خدمت کافی زیادہ کی۔ شروع سے لے کر آج تک یہی کھیل جاری ہے۔

اسی دوران پاکستانی عوام کو بدنظمی، بے انصافی اور عدم استحکام کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ امن وامان کی صورتحال اس قدر خراب ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ وہ سماجی معاہدہ جو ریاست کو شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے کا فرض سونپتا ہے بالکل ختم ہوکر رہ گیا ہے۔ ریاست محافظ کی بجائے لٹیرا بن گئی ہے جہاں حکومتی اہلکار شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کی بجائے ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے میں مصروف ہیں۔ پولیس، کسٹم سروس، ٹیکس کلکٹر اور جج تمام مال و دولت اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

کابینہ ابھی تک وسیع ہورہی ہے!

اب جبکہ کابینہ کے اراکین کی تعداد 49 تک جا پہنچی ہے تو ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب اتنی ساری ہونے والی بے انصافیوں کا ازالہ کرسکیں گے تاکہ ریاست لوٹ مار کرنے کی بجائے لوگوں کی خدمت کر سکے۔ اس کا جواب وزراء کے ریکارڈ پر نظر دوڑانے سے باآسانی مل جائے گا۔ کسی کا نام لئے بغیر یا تفصیلی مطالعہ کئے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام پاکستانی یہ جانتے ہیں کہ یہ جانے

پہچانے لوگ اپنے مفادات کے لئے ہر طرح کی حکومت کے وزیر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ سدا بہار وزیر کافی عرصے سے حکومت کے ایوانوں میں براجمان ہیں لیکن یہ (الف) ایک محکمے کی انتظامیہ کو بھی صحیح خطوط پر منظّم نہیں کر سکے (ب) اس علاقے کیلئے کبھی موثر قانون سازی کا محرک نہیں بنے جس کی یہ پارلیمنٹ میں نمائندگی کر رہے ہیں۔ البتہ ان کی دولت اور سیاسی اثر ورسوخ بڑھتا گیا ہے۔

کابینہ میں آخر اضافہ کیوں ہوتا ہے؟ عام خیال یہ ہے کہ حکومت کا عمومی میلان یہی ہوتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ ایم این اے حضرات کی حمایت حاصل رہے۔ ان کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے انہیں مراعات دی جاتی ہیں اور کافی سارے ایم این اے وزیر بنا دیئے جاتے ہیں۔ چونکہ وہ کافی پیسہ خرچ کر کے پارلیمنٹ تک پہنچے ہوتے ہیں اب انہیں یہ پیسہ سود کے ساتھ وصول کرنا ہوتا ہے اور کسی انتظامی عہدے کے بغیر اتنا پیسہ اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایم این اے حکومت کو حکومتی پارٹی سے علیحدہ ہونے کی دھمکی دے کر وزارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حکومت کو بھی پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت رکھنے کیلئے اپنی اکثریت کو برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے چنانچہ وہ عہدوں کو بانٹ کر کابینہ کے حجم کو وسعت دے دیتے ہیں۔

کابینہ کی توسیع۔ حکومت کی ضرورت

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس معمے کو سلجھانے کے لئے نہ تو عوام اور نہ ہی میڈیا نے کسی قسم کی کوئی دلچسپی ظاہر کی ہے۔ عوام تو اس لئے دلچسپی نہیں لے رہے کیونکہ ان کی شنوائی ہی نہیں ہوتی اور انہیں اپنی سانس کی ڈوری کو قائم رکھنا ہی مشکل ہو رہا ہے چنانچہ وہ اس طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے اور جہاں تک میڈیا کا تعلق ہے تو اسے بھی اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے حکومت کے قائم کردہ نظام کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب کبھی بہت ہی اہم عہدہ کسی ایسے شخص کو دے دیا جاتا ہے جس کی تعلیمی قابلیت نہ ہونے کے برابر ہو تو کسی قسم کا مباحثہ یا گفتگو نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں نہ تو کوئی صحافی اور نہ کوئی ایڈیٹر وزیر کی تعلیم یا بحیثیت سیاستدان اس کے ریکارڈ کے بارے میں تبصرہ کرتا ہے۔

اب ہمیں اچھی حکومت کی ضرورت کو محسوس کرنا چاہئے اور بڑی حکومت کے نقصانات کا اندازہ ہو جانا چاہئے۔ کابینہ کے بڑھتے ہوئے حجم سے (الف) سیاستدانوں کی تباہ کن سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ (ب) کابینہ میں وہی لوگ شامل کئے جاتے ہیں جو کرپشن میں دلچسپی رکھتے ہوں اور قانون سازی یا پارلیمنٹ کو اہمیت نہیں دیتے۔ (ج) حکومت کا حجم اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ صحیح

اور مناسب طور پر اپنا کام نہیں کر سکتی ۔ چونکہ سیاستدان خود تو احساس ذمہ داری سے محروم ہو چکے ہیں اب انہیں زبردستی ذمہ دارانہ رویہ اپنانے پر مجبور کیا جانا چاہئے ۔ اور شہریوں کو بھی اس پر مجبور کرنا چاہئے کہ وہ احتجاج کے ذریعے حکومت پر کابینہ کو محدود رکھنے کے لئے دباؤ ڈالیں اور اس کے لئے یہ آئین میں ترمیم کرنے کا اہتمام کیا جانا چاہئے ۔

اس طرح کی آئینی ترمیم اس بات کو یقینی بنائے گی کہ انتظامیہ کے لئے کابینہ کی محدود نشستیں ہیں جن پر تقرری ہو سکتی ہے ۔ اس طرح کابینہ میں اضافہ کرنا مشکل ہو جائے گا اس طرح سے سیاست میں سازشوں میں کمی آئے گی اور انتظامی امور کو شفاف طریقہ سے نپٹایا جا سکے گا اور صاف حکومت کو یقینی بنانے میں مدد ملے گی ۔

(30)

جمہوریت کی مضبوط بنیادیں

اگر چہ جمہوری نظام کی ابتداء کر دی گئی ہے اور اسے برقرار رکھنے کی کوشش بھی جاری ہے لیکن عملی اور قابل عمل نظام قائم نہیں کیا جا سکا جس کی کئی وجوہات ہیں جو درج ذیل ہیں۔

1- وہی خاندان جو نسل در نسل غیر جمہوری حکومتوں کا اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ساتھ دیتے رہے ہیں آج بھی قائم ودائم ہیں اور اب جمہوری قوتوں کے حامی بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کسی پیداواری عمل میں حصہ لئے بغیر امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے سیاسی اثر کو اپنے ذاتی فائدے کے لئے استعمال کرتے ہیں بجائے اس کے کہ قومی مفاد کے لئے اسے استعمال کریں۔ عموماً ان خاندانوں کا ایک فرد ایک سیاسی جماعت سے وابستہ ہوتا ہے جبکہ دوسرا کسی اور سیاسی جماعت سے! چنانچہ جس پارٹی کی بھی حکومت قائم ہو ان کے مفادات کو گزند نہیں پہنچا سکتی۔ اس طرح وہ نظام کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

2- سیاسی جماعتیں بے قاعدہ افراد پر مشتمل ہوتی ہیں جن کا کوئی نقطہ نظر ہی نہیں ہوتا شاید یہی وجہ ہے کہ کسی بھی پارٹی کے پاس کوئی مربوط منشور یا پروگرام نہیں جو کسی مباحثہ یا گفتگو کو جنم دے سکے نہ میڈیا میں اور نہ ہی عوام میں! اس طرح کسی پارٹی کے پاس کوئی ایسا منشور ہے ہی نہیں کہ جس کے بل بوتے پر الیکشن لڑا جا سکے۔

3- ذاتی فوائد کے لئے سیاسی وابستیوں کو تبدیل کر لینے پر کسی کو کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑتا۔ ابھی تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کیا جا سکا کہ جس کی مدد سے سیاستدانوں کو اجتماعی فلاح کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ رشوت اور وزارتی عہدوں کی پیشکشوں کی کہانیاں بہت عام ہیں۔ وزیر اعظم نے ایک مرتبہ خود بتایا کہ ایک ایم این اے نے انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا اور اس کے عوض انہیں اپنا مطالبہ پورا کرنے کو کہا۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس شخص کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

4- اگر چہ کوئی ثبوت تو اکٹھے نہ کئے جا سکے لیکن یہ تاثر کافی پختہ ہو گیا ہے کہ منتخب نمائندے اور

ان کے رشتہ دار وہ سب کچھ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کرتے ہیں جو کہ قانون کے سراسر خلاف ہوتا ہے۔اس طرح سے وہ ذاتی فوائد حاصل کرتے ہیں۔اسی لئے عوام میں منتخب نمائندوں کی کوئی عزت یا احترام نہیں۔اس کے باوجود کہ کرپشن، اثر ورسوخ کا غلط استعمال اور دوسری ناجائز سرگرمیاں عام ہیں اور ان سے متعلق کہانیاں بھی زیر گردش رہتی ہیں لیکن ابھی اس رویے کی تفتیش کرنے کے لئے کوئی کمیٹی قائم نہیں کی گئی۔

5- حکومت اس قدر طاقت رکھتی ہے کہ وہ سیاسی اور دوسری اقسام کی نوازشات عطا کر سکتی ہے۔وزارتیں اور دوسرے عہدے بغیر یہ جانے عطا کر دیئے جاتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ملکی خزانے پر کتنا بوجھ پڑے گا اور یہ بھی خیال نہیں کیا جاتا کہ عہدے سے نوازا جانے والا شخص اس عہدے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں پارٹی کے سربراہ کو کابینہ میں تمام جگہیں پوری کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔اور ان جگہوں کو پر کرنے کے لئے ہمیشہ مجرموں اور نالائقوں کا ہی انتخاب کیا جاتا ہے۔کابینہ بعض دفعہ اتنی وسیع ہو جاتی ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ تمام پارلیمنٹ کے ارکان کو وزیر بنا دیا گیا ہے۔ہمارے سیاسی نظام میں اس بات کو بھی اہمیت نہیں دیجاتی کہ ایک وزیر میں اپنی وزارت سے متعلق تکنیکی معاملات کو سلجھانے کی اہلیت بھی ہے یا نہیں۔

6- حکومت میں ذمہ داری کے احساس نام کی کوئی چیز نہیں۔امن وامان کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے اور مہذب ومعقول شہریوں کو بند دروازوں کے پیچھے چھپ کر پناہ لینی پڑتی ہے جبکہ بدمعاش گلیوں میں دندناتے پھر رہے ہیں وہی اصل حکمران محسوس ہوتے ہیں پھر بھی حکومت کو کوئی پروہ نہیں۔کسی وزیر یا حکومتی عہدے دار نے کبھی ذمہ داری نہیں دکھائی۔ہمارے منتخب رہنما سوائے ہیلی کاپٹروں کی سیریں کرنے کے اور کوئی کام نہیں کرتے یا پھر غیر ملکی دوروں پر وسائل اور وقت برباد کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

7- ہمارے منتخب نمائندوں نے قانون سازی کے عمل سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا حالانکہ ان کا اصل کام یہی ہے کہ وہ قانون سازی کریں۔دراصل ذوالفقار علی بھٹو، بینظیر بھٹو اور ضیاء کے عہد کا ہمیں تجربہ یہی ہوا کہ قانون سازی کو ہمیشہ پس پشت ڈالا گیا۔اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ یا تو ہم ترقی کی اس منزل تک جا پہنچے ہیں کہ ہمیں اب کسی قانون بنانے کی ضرورت ہی نہیں یا پھر ہمارے منتخب نمائندے حالات پر قابو پانے کے قابل نہیں اور وہ قانون سازی کو اہمیت نہیں دیتے۔سابقہ بیان اس لئے درست نہیں ہوسکتا کیونکہ نئے قوانین کی ضرورت تو امریکہ میں بھی پڑتی ہے جیسے ٹیکس

بل، ہوا کی صفائی کا بل، بینکنگ سے متعلق قانون سازی، کانگرس میں برتاؤ سے متعلق قانون وغیرہ۔ ہم بھی یہ قوانین متعارف کرواسکتے ہیں۔ایک چیز جس نے مجھے کافی حیران کیا کہ دیر سے قائم مغربی جمہوریتوں میں عوامی نمائندے یا وہ جو نمائندے بننا چاہتے ہوں قانون سازی میں ازحد دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایم این اے حضرات عہدے لینے میں تو بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن کبھی کوئی موثر قانون یا بل پر بات چیت کرنا وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ یہ بھی حیرانی ہی کی بات ہے کہ میڈیا نے بھی ان کی طرف سے قانون سازی میں عدم دلچسپی پر کبھی کوئی گرفت نہیں کی۔ ہمیں اپنے سیاستدانوں سے ہر موقع پر پوچھنا چاہئے اور اس معاملے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے کہ

(i) عوام کے مفاد کے لئے اب تک آپ نے کیا کچھ کیا ہے؟

(II) جب آپ پارلیمنٹ میں جائیں گے تو کس قسم کی قانون سازی تجویز کریں گے۔

(iii) اگر ہم آپ کو منتخب کر لیں تو آپ کس قسم کی اور کن مسائل سے متعلق قانون سازی تجویز کرنا پسند کریں گے؟

یہ مسائل اس وقت تک حل نہ ہونگے جب تک ہم ان پر توجہ صرف نہیں کریں گے۔ پاکستان میں جمہوریت اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک ایسے قوانین نہ بنائے جائیں اور انہیں نافذ نہ کیا جائے جو عوامی نمائندوں کو ذمہ دارانہ رویہ اپنانے پر آمادہ یا مجبور کریں۔ یہ سوچنا سراسر بے وقوفی ہے کہ الیکشن کرواتے رہنے سے ہی ان میں ذمہ داری پیدا ہو جائے گی۔ حالانکہ جب بھی کوئی حکومت قائم ہوتی ہے تو الیکشن کے علاوہ لمبے اور جامع آئینی ضابطے، دستور العمل اور فوجداری سے متعلق قوانین کو بھی وضع کرتی ہے تاکہ اگلے الیکشن تک اخلاقی و سیاسی حکومت صحیح خطوط پر کام کرتی رہے۔ ہمیں جب بھی ضرورت محسوس ہو تو حکومت کرنے کے ضوابط اور قواعد میں ترمیم کرنا بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ حکومت ویسی ہی ہو سکے جیسا کہ عوام چاہتے ہیں اس لئے ہر آئینی ترمیم پر بھرپور مباحثہ ہونا چاہئے۔ لیکن صرف الیکشن یا آئین ہی پر انحصار کرنا کافی نہ ہوگا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ نظام قائم رہے تو ہم سب کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ شہریوں کو کوئی ایسا طریقہ کار وضع کرنا ہوگا تاکہ ان کی آواز سنی جائے اور شہریوں کی تنظیمیں جیسے پریشر گروپ، پروفیشنل گروپ وغیرہ کو بھی اپنا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ یہ سوچتے ہوئے میں درج ذیل تجاویز پیش کر رہا ہوں۔

1- ابتدائی مرحلے کے دوران، جب ہم جمہوری حکومت قائم کریں گے تو پارلیمنٹ کو صرف

ایک سال کے لئے منتخب کرنا چاہئے پارلیمنٹ کا انتخاب ہر سال ہوتو دوسرے چیکس اینڈ بیلنس کے علاوہ جوابدہی کا عمل بھی تیز ہو جائے گا۔ سیاستدانوں کو اپنے حلقوں پر زیادہ توجہ دینی پڑے گی۔ اور انکے انداز سیاست پر بھی اس سے خاصا اثر پڑے گا کیونکہ انہیں اپنے ووٹروں کے سامنے ہر سال حاضری دینا پڑے گی۔ اسی طرح اسمبلی سے جو معاوضہ ملتا ہے جو کم ہو جائے گا کیونکہ مدت اقتدار میں کمی آ جائے گی اس طرح اس سکیم کے ذریعے ان لوگوں کو سامنے آنے کا موقع ملے گا جو قانون سازی اور پارلیمانی امور میں دلچسپی رکھتے ہونگے۔

2- وزارتوں کی تعداد اور دیگر ایسے عہدے جنہیں حکومت بانٹ کر فائدہ حاصل کر سکتی ہو انہیں آئینی ترمیم کے ذریعے کم کر دینا چاہئے۔ حکومت کو وزیروں کی تعداد کو صرف اس لئے بڑھانے سے روکنا چاہئے کہ اسے اقتدار میں رہنے کے لئے ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وزیروں کی تعداد بڑھا کر اپنے حمایتیوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ بھی عوام کے علم میں ہونا چاہئے کہ کابینہ کا بڑھا ہوا حجم اس کی اہلیت کو منفی طور پر متاثر کرتا ہے۔

3- وزارتوں یا دوسرے اہم عہدوں کے لئے مقرر کئے گئے افراد کی اہلیت کو جانچنے کے لئے کوئی کمیٹی بنا دی جائے تا کہ امیدوار کی تعلیم، تجربے اور دیگر صلاحیتوں کو پرکھا جا سکے۔ اس عمل کے ذریعے یہ یقینی بنایا جا سکے گا کہ (الف) امیدوار اس عہدے کے لئے ضروری اہلیت رکھتا ہے اور عوام کے مفاد میں وقت پڑنے پر نئے نظریات و خیالات پیش کر سکتا ہے۔ (ب) امیدوار کا اخلاقی کردار ایسا ہے کہ اپنے فرض سے ایمانداری اور خلوص سے نبرد آزما ہو سکے اور اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح نہ دے۔

4- ''سیاسی جماعت'' کی اصطلاح کو مزید واضح کرنا چاہئے کیونکہ جب بھی کسی کا جی چاہتا ہے اپنے ڈرائنگ روم میں اپنی سیاسی جماعت بنا لیتا ہے۔ اس عمل کا تدارک کرنا ضروری ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ سیاسی جماعت کا پروگرام عوام کے بڑے حلقے میں تقسیم ہو۔ کسی قسم کے رجسٹریشن کے عمل کے ذریعے سے یہ تخمینہ لگانا ضروری ہے کہ اس جماعت کو کتنے ووٹروں کی حمایت حاصل ہے۔ انتخابات کے وقت تمام پارٹیوں کے لئے یہ ضروری قرار دے دیا جانا چاہئے کہ وہ ایک بڑی رقم جمع کرائیں اور اگر کوئی پارٹی نشستوں کی مقررہ تعداد حاصل نہ کر سکے تو یہ رقم ضبط کر لی جائے بے شک یہ شرط اس پارٹی کے لئے سخت ہوگی جسے صرف غریب لوگوں کی حمایت حاصل ہوگی مگر موجودہ نظام میں بھی تو غریبوں کی کوئی شنوائی نہیں! سیاست اس نظام کے تحت بھی امیروں کا کھیل ہے۔

5- تمام سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کو اپنے اثاثوں کا حساب کتاب رکھنے کو کہا جانا چاہئے انکا ٹیکسوں کے طور پر ادا کیا ہوا پیسہ اور انکے براہ راست یا بالواسطہ مالیاتی اثاثے عوام کے علم میں ہونے چاہیں۔ امریکہ میں یہ نظام رائج ہے اور یہ بڑا معقول نظام لگتا ہے۔ امیدوار خاص طور پر کامیاب امیدوار کو اپنے کاروباری مفاد سے دوری رکھنی پڑتی ہے۔ مثلا امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ جیمز بیکر کو اپنے دادا کی طرف سے ورثے میں ملے بینک کے اپنے حصے سے دستبردار ہونا پڑا تھا کیونکہ اس کیس میں مفادات کے تضاد کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔

6- میڈیا خاص طور پر حکومت کی ملکیت میں شعبے مثلاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو سیاسی جماعتوں اور امیدواروں کے مابین مباحثے لگاتار عوم تک پہنچانے چاہیں۔ اس مقصد کے لئے کافی سارے مختلف پیشہ وراور دوسرے دلچسپی رکھنے والے گروپوں کی خدمات بھی حاصل کرنی چاہیں۔

7- الیکشن کمیشن کو وقتاً فوقتاً نئے ضوابط جاری کرتے رہنا چاہئے اور وفاقی محتسب کے ساتھ مل کر اسے جمہوریت کی حالت پر رپورٹ بھی تیار کرنی چاہئے جس میں الیکشن سے متلق مسائل پر بھی اظہار خیال ہو نیز ایم این اے حضرات اور دیگر سیاستدانوں کے رویوں کا بھی جائزہ اس رپورٹ میں لیا جانا چاہئے ایسی رپورٹ پانچ سالوں میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور مرتب ہونی چاہئے۔ اس سے کم تفصیل کی رپورٹیں بھی وقتاً فوقتاً تیار کی جانی چاہیں جن میں ایک ایک کر کے ہر ایم این اے کی کارکردگی کو جانچا جا سکے۔ علاوہ ازیں پارلیمانی سیکرٹری کو ہر ایم این اے کا ایک ریکارڈ بھی تیار کرنا چاہئے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہو کہ اس نے قانون سازی میں کتنی اور کون کونسی تجاویز ایوان میں پیش کیں۔

8- نجی شعبے کو بھی جمہوریت پر نگرانی کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ اس کردار کے ذریعے سے وہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکتا ہے۔ وہ ایک سٹینڈنگ کمیٹی قائم کر سکتے ہیں جس کے ذریعے سے جمہوریت کی معاصرانہ روایات کی جانچ پرکھ کی جاتی رہے۔ اس سٹینڈنگ کمیٹی کو پیسے کی فراہمی مختلف پیشہ ور گروپوں کو کرنی چاہئے لیکن یہ خیال رکھا جانا چاہئے کہ کمیٹی جمہوری عمل میں آزاد اور غیر جانبدار فریق کی حیثیت سے جمہوریت کے نگران کے فرائض ادا کرے۔

9- عدالتوں کو پوری طرح سے آزاد بنانے کے لئے ضروری اقدامات اٹھانے چاہیں تا کہ انصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکے اور انصاف ملنے میں ہونے والی تاخیر سے بھی چھٹکارا پایا جا سکے۔ امریکہ میں سپریم کورٹ کے ججوں کی تقرری کی منظوری پارلیمنٹ کے دونوں ایوان بھی دیتے

ہیں ہمیں ان سے یہ نظام مستعار لے لینا چاہئے اور عدالتی نظام پر بھی کھلے عام نظر ثانی ہوتی رہنی چاہئے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عوام یہ جان سکیں گے کہ اس نظام کو مزید بہتر بنانے کے لئے ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے اور کس چیز کی نہیں۔

اگر ہم پاکستان کے شہری' صرف علیحدگی اختیار کئے ہوئے اس سیاسی کھیل کو دیکھتے رہے تو یقینی بات یہ ہے کہ یہاں کبھی ذمہ دار حکومت کا قیام ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہمارے منتخب نمائندوں نے نہ کبھی اس نظام کو بہتر بنانے میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور نہ ہی ان میں ایسی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ پانچ سالوں میں صرف ایک مرتبہ جاگ کر ووٹ ڈال دینے کے بعد ہمیں یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ یہ لوگ جو کہ مرقع غیر ذمہ داری ہیں اب ذمہ دارانہ برتاؤ کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیں گے۔ جبکہ ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر محو خواب رہیں گے۔ زندہ جمہوریت تو وہ ہوتی ہے جس میں شہری کسی نہ کسی طرح چیکس اور بیلنس کو ترقی دینے میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔

(31)

اہل حکومت کی ذمہ داریاں

1- ہمیں اہل حکومت کی کیوں ضرورت ہوتی ہے

کم از کم دو بہت اہم وجوہ ذہن میں فوراً آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ حکومت معاشی پیداوار کے بہت بڑا حصہ ہڑپ کر جاتی ہے جو خام قومی پیداوار (G.D.P) کا 25 فیصد تو ہر حال میں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس کا چوتھائی حصہ حکومت اڑا لیتی ہے۔ حکومت کو اگر اہل بنا دیا جائے اور اس کی کارکردگی میں بہتری لائی جائے تو کم از کم اس بات کا امکان تو ہے کہ اس کے اخراجات میں بہت حد تک کمی آ جائے گی اور ملکی پیداوار کا ضیاع کم ہو گا اور اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ عوام کی فلاح پر خرچ کے لئے کام آ سکے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حکومت ہماری روزمرہ کی زندگیوں میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تقریباً ہماری تمام سماجی و معاشی سرگرمیوں پر حکومت کسی نہ کسی طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ خواہ وہ ہمارے بچوں کی تعلیم ہو یا ہمارا گاڑی کا چلانا ہو غرضیکہ ہر ضمن میں حکومت کی مداخلت لازمی ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جس طریقے سے کاروبار حکومت چلایا جاتا ہے اس کا اثر براہ راست طور پر ہم سب کی زندگیوں پر پڑتا ہے اور معاشرے کی مجموعی پیداوار اس سے متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ اگر حکومت کی کارکردگی میں بہتری آئی تو نجی شعبے کی کارکردگی بھی بہتر ہو جائے گی۔ اس طرح حکومت اگر مختلف شعبوں سے اجتناب برت کر، وسائل کی بچت کر لے تو یہ فائدے کی بات نہیں فائدہ اس میں ہے کہ وہ ہر شعبے اور ہر کام میں بیجا دخل اندازی کرتے رہے۔ ہم سب کی سوچ کچھ اس طرح کی ہے۔

2- اہل حکومت ہوتی کیا ہے

ایک اہل حکومت وہ ہوتی ہے جو براہ راست طور پر صاف اور سادہ انداز میں چند واضح سماجی مقاصد کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ اس تعریف کو اگر عملی شکل دی جائے تو سب سے پہلے یہ

ضروری ہوگا کہ حکومت کے مقاصد تعداد میں محدود اور واضح ہوں اور عوام سے چھپے ہوئے نہ ہوں اور دوسری بات جو اسی قدر اہم ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے اس کا طریقہ کار شفاف ہو اور حکومت کے عزائم سے یہ واضح ہوتا ہو کہ وہ ہر طرح سے سنجیدہ ہے۔ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت اور اس کے محکموں و دیگر تنظیموں کو دو اصول اپنانے چاہیں (الف) ان کی کارکردگی واضح، سادہ اور ہر ایک پر عیاں اصولوں پر مبنی ہو (ب) بیوروکریسی کی بے شمار تہوں میں کمی کر دینی چاہئے تا کہ حکومت کے منتظمین کو ان لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے میں آسانی ہو جن کے ساتھ انہیں ملکر کام کرنا ہوتا ہے۔

حکومت کو اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ متحرک بنانا چاہئے تا کہ اس کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو۔ اس لئے حکومت کو وقتاً فوقتاً اپنی کارکردگی اور اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے طریقوں پر شہریوں کے ساتھ مل کر نظر ثانی کرتے رہنا چاہئے تا کہ اس کی مجموعی اہلیت میں اضافہ ہو سکے۔

3- ہمیں حکومت پاکستان کی اہلیت کا کس طرح جائزہ لینا چاہئے۔

آیئے حکومت کی مذکورہ بالا تعریف کو ذہن میں رکھتے ہوئے کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں جہاں تک حکومت کے مقاصد کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس کے مقاصد کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور یہ مقاصد مبہم بھی ہیں۔ حکومت کے اعلانات یوں تو اچھے ارادوں پر مبنی ہوتے ہیں جیسے زیادہ ترقی کے حصول کی کوشش اور فلاح میں اضافہ وغیرہ لیکن ان ارادوں کو جان بوجھ کر مبہم رہنے دیا جاتا ہے تا کہ حکومت کے دائرہ عمل میں اضافہ ہو سکے۔ چنانچہ حکومت بینکر، اشیاء پیدا کرنے کی ذمہ دار، قیمتوں کی مقرر کنندہ، خوراک، رہائش، ادویات اور کپڑے وغیرہ کی فراہمی۔ یہ سب ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ حکومت نے اس ملک میں ہونے والے تقریباً ہر کام میں اپنے آپ کو ملوث کر لیا ہے۔

جہاں تک حکومت کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنائے جانے والے ذرائع کا تعلق ہے تو چونکہ حکومت نے اپنے کردار اور اپنی ذمہ داریوں میں اس قدر اضافہ کر لیا ہے کہ اس کے لئے اب ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ بیوروکریسی کی پیچیدگیوں میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ لوگوں کو ایک محکمے سے دوسرے محکمے کے درمیان چکر لگاتے رہنے کے باوجود ناکام و نامراد ہی رہنا پڑتا ہے آپ کو کسی بھی معاملے میں حکومت کا کوئی واضح قاعدہ یا اصول کم ہی دکھائی

دے گا اور نہ ہی حکومت کا کاروبار واضح اور سادہ اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ حکومت بیوروکریسی کی مرضی اور قوت کو مستحکم بنانے ہی کو ترجیح دیتی ہے۔

حکومت کی جانب سے ایسی کوششیں کبھی نہیں ہوئیں اور نہ ہی ایسی کوشش ہوتی محسوس ہو رہی ہے کہ ایسے محکموں کو بند کر دیا جائے جو کارکردگی کے لحاظ سے کمزور ہیں صرف ایسے محکموں کو قائم رہنے دیا جانا چاہئے جو کارکردگی میں نمایاں ہوں۔ دراصل محکموں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی کوششوں کو زائل کر دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہر محکمے میں بہت زیادہ تہیں ہوتی ہیں جیسے وفاقی وزیر۔ وزیر مملکت۔ سیکرٹری جنرل۔ سیکرٹری ایڈیشنل سیکرٹری۔ جوائنٹ سیکرٹری۔ ڈپٹی سیکرٹری۔ سیکشن آفیسر۔ فیصلہ سازی کے عمل میں ان آٹھ تہوں کے ہوتے ہوئے وزراء اور سیکٹریوں کا عوام سے رابطہ رکھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ وزیر اور سیکرٹری اور عوام کے درمیان چھ یا اس سے بھی زائد آفیسرز حائل رہتے ہیں۔

4- ہم حکومت کی اہلیت میں کیونکر اضافہ کر سکتے ہیں۔

میرے خیال میں اس عمل کی ابتداء حکومت کے رول کی صحیح تشریح کرنے سے ہونی چاہئے۔ اس تشریح و تعریف (Definition) میں حکومت کے دائرہ عمل کو کم از کم سرگرمیوں تک محدود کر دینا چاہئے۔ میرے خیال میں حکومت کو صرف چار ذمہ داریاں سونپنی چاہیں جو درج ذیل ہیں۔

(الف) اشیاء اور خدمات کی فراہمی

حکومت کا بنیادی فرض یہ ہونا چاہئے کہ اس سماجی معاہدے کے تحت جو کہ عوام اور حکومت کے درمیان ہوتا ہے اپنے تمام شہریوں کو ایسی سہولتیں فراہم کرے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں۔ حکومت کم از کم طور پر شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے کر ایسا کر سکتی ہے۔ اگر یہ حاصل کر لیا جائے تب تمام شہریوں کا معیار زندگی بہتر بنانے کی سعی کی جا سکتی ہے۔ بحر حال ان کاموں کو ایک ترتیب سے انجام دینا بہت ضروری ہے۔

(ب) بنیادی وسائل (Infrastructure) اور عوامی بھلائی کی فراہمی

بعض چیزیں تمام شہریوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں لیکن انہیں نجی حیثیت میں پیدا یا فراہم نہیں کیا جا سکتا ان چیزوں کو عوامی بھلائی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ملک کا دفاع ہم سب کے

لئے بہت ضروری ہے اور اسے پرائیویٹ ہاتھوں میں نہیں سونپا جا سکتا۔ اسی طرح بنیادی مثلاً رسل و رسائل یا سڑکیں وغیرہ تعمیر کرنے میں بہت بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اگر انہیں نجی شعبے کے حوالے کر دیا جائے تو یہ بڑی بڑی اجارہ داریوں کے ظہور کا سبب بن جاتی ہیں چنانچہ بہتر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ سرکاری شعبے کے تحت رہیں۔ مثال کے طور پر کچھ عرصہ پہلے تک ٹیلی فون، سڑکیں اور بجلی کی فراہمی وغیرہ کو ایسی چیزیں تصور کیا جاتا تھا کہ جن کا ارتکاز سرکاری شعبے کے ہاتھ میں ہونا چاہئے لیکن حالیہ دنوں میں بہت سے ممالک نے ان سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے نجی شعبے کو دعوت دی ہے جیسے ارجنٹائن نے بین الاقوامی بولی کے بعد اپنا ٹیلی فون کا نظام نجی شعبے کے ہاتھوں میں سونپ دیا ہے۔

اس اصول کے مطابق جو کہ اپنایا جانا چاہئے کہ حکومت کو اس عوامی بھلائی میں حصہ لینا چاہئے جس میں اسے یقین ہو کہ نجی شعبہ حصہ نہیں لینا چاہتا اور اگر اس عوامی بھلائی میں بعد ازاں نجی شعبہ دلچسپی کا اظہار کرے تو اسے خاموشی سے پیچھے ہٹ جانا چاہئے۔ ایک بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ دنیا میں ہر جگہ حکومت لمبے دورانئے کی سرگرمیوں (Longer term project) میں قیمتوں کے حوالے سے باخبر کبھی نہیں رہی۔

(ج) معاشی ضوابط کی تشریح

اپنی روزمرہ کی زندگی میں شہریوں کو معاہدوں کے ذریعے سے معاشی لین دین کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاہدے اور سودے باہمی رضامندی کے ساتھ قانونی حد بندی میں رہتے ہوئے انجام پانے چاہیں۔ دوسرے لفظوں میں جیسے ہر انسانی کاوش میں ایک ایمپائر یا ریفری کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح حکومت کو بھی ریفری کے فرائض تک ہی محدود رہنا چاہئے اسے ایک ایسا فرہم ورک تشکیل دینا چاہئے جس میں رہتے ہوئے ہم ''شہری'' امن کے ساتھ سودے طے کر سکیں۔

حکومت یہ کام معاشی ضوابط بنا کر کر سکتی ہے۔ یہ کام مزید بہتر انداز میں اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت مسلسل اپنے آپ کو ہونے والی ترقی سے آگاہ کرتی رہے۔ اس کا مقصد یہی ہونا چاہئے کہ وہ ایسے قوانین بنائے اور انہیں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل کرتی رہے کہ نجی شعبے میں ہونے والی معاشی سودے بازی اور معاہدے آسان ہو جائیں اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے اور اس سماجی معاہدے کی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ حکومت انصاف کے ساتھ ضوابط بنائے اور ایسی قانون سازی کرے جس سے ترقی میں اضافہ ہو سکے۔

(د) معاشی ضوابط کا نفاذ

قوانین اور ضوابط اس وقت تک بے مقصد رہتے ہیں اور یہی حال حکومت کی ساکھ کا بھی ہو جاتا ہے جب تک انہیں موثر انداز میں نافذ نہ کیا جائے۔ اس لئے ایسے عدالتی نظام کی سخت ضرورت ہوتی ہے جو تیزی اور اہلیت کے ساتھ انصاف فراہم کر سکے۔ اگر ایسا نظام قائم نہیں ہو سکتا تو ہمیں ایک نامناسب نظام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس میں ٹھگ اور ڈاکوؤں کے گروہ شامل ہوں گے تاکہ وہ ہمارے معاہدوں کو نافذ کریں جو کہ نامعقول اور غیر مناسب کام ہوگا۔ ایک اہلیت رکھنے والا عدالتی نظام جس پر شہریوں کو اعتماد ہو قائم کیا جانا چاہئے بلکہ پاکستان کی اس وقت سب سے بڑی ضرورت بھی یہی ہے۔ اور ایسے نظام کو قائم کرنے میں ہمیں پہلے ہی بہت تاخیر ہوگئی ہے۔

اگر ہم حکومت کا اس قدر محدود کردار تسلیم کر لیں جو انہی سرگرمیوں کی انجام دہی پر ہی مبنی ہو تو بقیہ سرگرمیوں سے حکومت کو نہ صرف گریز کرنا چاہئے بلکہ اسے ان سے پیچھے ہٹ جانا چاہئے۔ تب حکومت کا اشیاء اور خدمات کی پیدائش میں کوئی کردار نہ رہے گا اور نہ ہی وہ اس طرح کے بے شمار منصوبوں میں ملوث ہوگی جیسے تحقیقی مراکز کو قائم کرنا۔ پرچون کی دکانیں کھولنا یا قیمتی پتھروں کی دکان سجانا وغیرہ بلکہ حکومت کی توجہ امن و امان قائم کرنے' موثر قواعد اور انصاف فراہم کرنے میں صرف ہوگی جو شہریوں کے معاشی مفادات کی حفاظت کیلئے از حد ضروری ہے۔

(32)

پاکستان کی تاریخ میں سول سروس کا کردار

پاکستان کی معیشت نے تمام توقعات سے بڑھ کر کارکردگی دکھائی۔ تباہی کی بہت سی پیشین گوئیوں کے باوجود معیشت ترقی کرتی رہی اور شہریوں کا عمومی معیار زندگی بہتر ہوتا رہا۔ پچھلی 45 سالہ تاریخ میں پاکستان کی معاشی کارکردگی شاندار رہی ہے کیونکہ معیشت کی شرح نمو (Growth rate) اوسطاً 5.5 فیصد سالانہ اور افراط زر اوسطاً 10 فیصد سے کم رہا ہے۔ لیکن اس کارکردگی کی وجہ بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ ہوتا تو یہ ہے کہ معیشت کی شرح نمو اس ملک میں ہونے والی سرمایہ کاری جو کہ وہ طبعی اشیاء کی اور انسانی سرمائے کی پیدائش کے شعبے میں کرتا ہے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ سرمایہ کاری لوگوں کی بچت کے پیسے سے ہوتی ہے۔ پاکستان میں نہ صرف ہماری بچت بلکہ سرمایہ کاری کی شرح بیشتر ترقی پذیر ممالک سے کم ہے لیکن ہماری معیشت کی شرح نمو ان سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم اپنی معیشت کی نمو پر تو توجہ دیتے ہیں مگر اس طرف توجہ نہیں دیتے کہ یہ نمو کن ذرائع کے باعث وجود میں آ رہی ہے۔

تاریخی طور پر جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں اس کی خام قومی پیداوار کے تناسب سے جو مالیاتی خسارہ رہا وہ بہت سے ترقی پذیر ممالک سے زیادہ ہے (پچھلے 20 برسوں میں یہ خسارہ اوسطاً خام قومی پیداوار کا 6 فیصد رہا)۔ مالیاتی خسارہ ان اضافی ذرائع کی جانب اشارہ کرتا ہے جن کی حکومت کو ضرورت ہوتی ہے۔ ان اضافی ذرائع کے حصول کے لئے حکومت یا تو قرض لیتی ہے یا نئے کرنسی نوٹ چھاپ لیتی ہے۔ جب حکومت قرض لیتی ہے تو اس کا اثر نجی شعبے پر پڑتا ہے کیونکہ اس کے لئے قرض لینے کے مواقع مسدود ہو جاتے ہیں اور اس طرح معیشت کی نموست روی اختیار کر لیتی ہے۔ اور اگر حکومت اپنے خسارے کو کم کرنے کیلئے نئے نوٹ چھاپ لے تو معیشت میں افراط زر کا رجحان زور پکڑ لیتا ہے۔ افراط زر کے نتیجے میں پیسے کی قدر اضافی طور پر اشیاء کی قدر کی نسبت کم ہو جاتی ہے۔ اگر ایک اور طرح اس عمل کا جائزہ لیا جائے تو اسے اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب پیسے کو معیشت کی پیداواری صلاحیت کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے پیدا کیا جائے

(نوٹ تیزی سے چھاپے جائیں) تو افراط زر وجود میں آ جاتا ہے۔اس تمام تر بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنے بڑے مالیاتی خسارے کا ہم شکار رہے ہیں اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ پاکستان میں یا تو معیشت کی نمو بہت سست رہتی یا افراط زر بہت زیادہ ہو جاتا لیکن اعداد و شمار میں ہمیں یہ دونوں چیزیں نہیں ملتیں۔

بعض اوقات اس کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہماری معیشت کی کامیابی کے پیچھے ہمارے ملک' اس کی معیشت اور اس کی سیاست کو بہترین انداز میں چلانے کی تدابیر کارفرما ہیں۔جن کے خالق بیوروکریٹ ہیں۔ ہماری معاشی تاریخ کی اس توجیہ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ترقی کا تمام تر انحصار چند بنیادی فیصلوں یا ان سمتوں پر رہا جو ہمارے پالیسی سازوں نے طے کیں۔اور مثال کے طور پر کرنسی کے تبادلے کی پالیسی کو پیش کیا جاتا ہے جسے ان کے بقول بہت بہتر انداز میں تشکیل دیا گیا۔ چند اہم سنگ میل اس دلیل کی بنیاد بنائے جاتے ہیں اور ان کا سہرا بیوروکریٹوں کے فیصلوں کے سر باندھا جاتا ہے۔

انہی حقائق کو بنیاد بنا کر مذکورہ بالا توجیہ کے بالکل برعکس توجیہ پیش کی جاتی ہے کہ چند ترقی کی رفتار کو تیز کرنے والی قوتیں مخفی طور پر کام کر رہی تھیں لیکن بیوروکریٹوں نے ان قوتوں کو زائل کرنے کے لئے اپنا کردار ادا کیا۔ان میں پہلی تو یہ تھی کہ پاکستان کا بڑا حصہ اور خاص طور پر پنجاب آزادی سے پہلے پورے برصغیر کو غلہ فراہم کیا کرتا ہے۔اس علاقے نے اپنی زرعی صلاحیت ایک وسیع نظام آبپاشی کے ذریعے بہت بڑھا لی کیونکہ اس نظام کی وجہ سے بڑا رقبہ زیر کاشت آیا۔اسی طرح یہ ایک ایسی قوت تھی جس نے پاکستانی معیشت کے استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ تاریخی وجوہات کی بنا پر یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ شروع ہی سے بیوروکریٹوں اور انتظامی مشینری کی دسترس سے باہر رہا۔انگریزوں کی ہندوستان کے سرحدوں کے علاقوں کو مرکزی کنٹرول کے تحت لانے میں ناکامی کے باعث قبائلی علاقہ جات وجود میں آ گئے۔ چنانچہ اس نظام میں سمگلنگ قانونی طور پر جائز قرار پائی اور اس سے بیوروکریسی کے کنٹرول میں بھی مزید کمی آ گئی مزید یہ کہ اس علاقے نے کالی معیشت کو جنم دیا اور اس نظام نے اتنے موثر انداز میں کام کرنا شروع کیا کہ مجبوراً حکومت کو بھی وہی کچھ کرنا پڑا جو کالی معیشت کے بانی کر رہے تھے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ ہم طبعی اور ثقافتی طور پر مشرق وسطی سے بہت قربت رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمیں وہاں تیل کی دولت سے فائدہ اٹھانے کے مواقع میسر آئے ہمارے لوگوں نے

ان حالات سے بہت تیزی سے فائدہ اٹھایا اور وہاں سے اتنی بڑی مقدار میں پیسے بھیجنے شروع کئے کہ اس نے ہماری Balance of Payment کی ضروریات کو بھی پورا کیا اور ساتھ ہی ساتھ سرمائے کی ضروریات کو بھی!

پاکستان کے اندر ہی ترقی کی بہت سی ترغیبات تھیں جنہیں غالباً بیوروکریسی کے حد سے زیادہ کنٹرول کے رجحان نے دبا دیا۔ چند بنیادی موڑ جن کا پہلے بھی تذکرہ کیا گیا اور جو بیوروکریسی کے فیصلوں کا نتیجہ تھے۔ انہیں یہ فیصلہ کرنے پر نجی شعبہ کی اہلیت اور جدت طرازی نے مجبور کیا۔ مثال کے طور پر ایوبی دور کے دنوں میں پاکستانی مزدوروں کو پاسپورٹ جاری نہ کئے گئے پھر بھی انہوں نے انگلستان یا مشرق وسطی جانے کے راستے تلاش کر لئے۔ جب مزدوروں کے باہر چلے جانے کے رجحان کو حکومت نے دیکھا تب اس نے پاسپورٹ جاری کرنے کے طریقہ کار کو آسان بنالیا۔

ہماری معاشی سوچ کا رجحان یہی رہا ہے کہ جس قدر زیادہ سے زیادہ کنٹرول کیا جا سکے کرنا چاہئے۔ کئی دہائیوں سے کرنسی کے تبادلے پر بیجا کنٹرول کیا جاتا رہا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف سمگلنگ کو تقویت ملی بلکہ غیر ملکی کرنسی کی ذخیراندوزی میں بھی اضافہ ہوا۔ رفتہ رفتہ غیر قانونی طور پر قائم غیر ملکی کرنسی کی مارکیٹ اتنی بڑی ہوگئی کہ حکومت کو پہلے تو ایف ای بی سی جاری کرنا پڑے اور بعد میں ایکسچینج کنٹرول کو ہٹا کر اس مارکیٹ کو قانونی حیثیت دے دی۔ یہاں غور طلب نقطہ یہ ہے کہ کئی دہائیوں تک بیوروکریٹک مشینری نے ہمیں یہی بتایا کہ لوگوں کی غیر ملکی کرنسی کی طلب اور غیر ملکی اشیاء کی خواہش کو دبانے کے لئے غیر ملکی کرنسی پر کنٹرول کرنا لازمی ہے۔ اس لئے اگر اس پر کنٹرول کو ہٹا دیا گیا تو ہم زرمبادلہ کھو دیں گے اور ریزرو میں رکھا پیسہ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا اس لئے ہمیں بین الاقوامی منڈی سے قرض لینا پڑے گا۔ لیکن جب یہ کنٹرول ہٹا دیا گیا تو اس سے بالکل الٹ ہوا ریزو کا پیسہ بڑھ گیا اور ڈالروں کے حصول کے لئے لوگوں نے دوڑ بھی نہ لگائی اس طرح کی سوچ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پالیسی سازوں کے کنٹرول کو ختم کرنے سے انکار کی وجہ سے ہم نے کیا نقصان اٹھایا؟

اسی طرح اگر ہم دوسری چیزوں پر بھی حکومتی کنٹرول کا جائزہ لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ کنٹرول کی اس پالیسی نے پاکستان میں معاشی نمو اور سرمایہ کاری کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ لائسنسوں کو جاری کرنے، قرض دینے کے عمل یا پھر حالیہ نجکاری کی کوشش کو دیکھیئے۔ ان تمام شعبوں میں حکومت نے یہ نہیں کیا کہ معاشی ترقی کو بڑھاوا دینے والی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرے بلکہ اس

نے فوائد کو اپنے پسندیدہ افراد کے حوالے کر دیا۔ فنانس کمپنیوں اور کوا پریٹوز کی افزائش کی مثال پر ہی غور کیجئے جو تین مرتبہ (1979, 1989, 1990) منظر عام پر آئیں اور ہر دفعہ حکومت نے اس طرح کے عمل سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کی یعنی اس نے گھن کے ساتھ گندم کو بھی پیس ڈالا اور ان دونوں کو علیحدہ کرنے کے لئے نہ تو کوئی قانون بنایا اور نہ ہی آڈٹ کا کوئی نظام رائج کیا۔ بجائے اس کے حکومت نے ان خود زد تنظیموں کا بھی خاتمہ کر دیا اور اپنے پسندیدہ افراد کو لائسنس جاری کر دیئے جنہوں نے سرکاری سرپرستی میں رہتے ہوئے ایسی تنظیمیں قائم کر لیں اور ان آجروں میں سے جو کہ پیشہ وارانہ مہارت اور ایمانداری کا جذبہ لئے ہوئے ایک کو بھی لائسنس نہ دیا گیا۔

حد سے زیادہ حکومتی کنٹرول اور حکومت کے حجم میں اضافے کے باعث بہت سی بیکار سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ بہت سے نئے محکمے قائم ہو گئے جن کی وجہ سے بیوروکریسی کا پیچیدہ طریق کار اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا علاوہ ازیں حکومت حد سے زیادہ نااہل اور ضیاع کار ہو گئی۔ جو کچھ حکومت کو عوام کو فراہم کرنا تھا جیسے صحت کے تحفظ کی فراہمی' تعلیم' سڑکیں اور بجلی وغیرہ۔ یہ اشیاء اب یا تو پیدا ہی نہیں ہو رہیں اور اگر پیدا ہو بھی رہی ہیں تو ان کا معیار بہت ادنیٰ ہے۔ اس طرح ہم ان گھٹیا اشیاء کے لئے بہت زیادہ قیمت ادا کر رہے ہیں۔

حکومت نے ایک لائسنس یافتہ نجی شعبہ بھی قائم کر لیا ہے جو کہ مقابلے کی سکت سے یکسر محروم ہے اور ہمیشہ حفاظت کے لئے استدعا کرتا رہتا ہے۔ حال ہی میں اٹپیما کی طرف سے میڈیا میں چلائی جانے والی مہم کا جائزہ لیجئے تو واضح ہو گا کہ ہماری ٹیکسٹائل کی اس قدر وسیع صنعت تقابلی برتری (Comparative advantage) کی بجائے حکومت کی طرف سے مسلسل فراہم کی جانے والی رعایت (Subsidy) کے دم سے قائم ہے۔ یہ دعوی عموماً کیا جاتا ہے کہ اگر خام کپاس کو رعایتی قیمت پر فراہم نہ کیا گیا تو سپننگ کی صنعت منافع بخش نہ ہو سکے گی حالانکہ ان لوگوں کو ہمیشہ لائسنسوں' سستے قرضوں اور ٹیکسوں سے چھوٹ جیسی رعایتوں سے نوازا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ لوگ آگے نہیں بڑھ سکے۔ دراصل یہ ایک ایسا نظام ہے جہاں بیوروکریسی نے سرمایہ کاری کا تعین کیا نہ کہ منڈی کی قوتوں نے۔ اس لئے ہماری اقتصادی کارکردگی میں بہتری نہ آ سکی۔

حکومتی وسعت کے باعث کرایہ طلبی (Rent Seeking) جیسی فضول روایت مستحکم ہو گئی۔ ایک نیا گروہ ظہور میں آ گیا اور وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ متعدد ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بعض ایجنٹوں کا تو کام ہی یہ ہوتا ہے کہ بیوروکریٹوں اور سیاستدانوں کو رشوت دیں تا کہ حکومت کو

غیر ضروری سامان اور آلات فروخت کر کے منافع کمایا جا سکے۔ چونکہ اس طرح آسانی سے امیر بنا جا سکتا ہے اس لئے بہت سے نوجوان جن میں اپنا مستقبل بنانے کی سکت ہے حکومت کے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں تا کہ انہیں بھی اسی طرح کی کمائی کے مواقع مل سکیں۔

میرا نتیجہ تو یہ ہے کہ پاکستان میں معاشی نمو حکومت اور بیوروکریسی کے باوجود وقوع پذیر ہوئی نہ کہ حکومت اور بیوروکریسی کی وجہ سے ایسا ہوا۔ دراصل ان رکاوٹوں کے باوجود کہ جو حکومت نے معاشی نمو کے راستے میں حائل کئے رکھیں یہ یقیناً حیرانی کی بات ہے کہ ہم نے معیشت کے میدان میں اتنی اچھی کارکردگی دکھائی۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت میں مزید لچک ہوتی اور وہ ملک کی ضروریات کو سمجھ پاتی تو ہم نے اب تک بہت ترقی کر لی ہوتی۔

(33)

انسانی سرمایہ اور حکومت کی اصلاح

وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ حکومت کی اصلاح کی جائے۔ اور ایسا کرتے وقت ہمیں کسی قسم کی کوئی گنجائش نہ چھوڑنی چاہئے جس کا سہارا لے کر حکومت اپنے آپ کو وسیع کر لے۔ ماضی کی طرف نظر دوڑانے سے پتہ چلے گا کہ جب بھی ہم نے کسی نئے نظریہ کو اپنایا مثلاً ''اسلامی سوشلزم'' اور ''بنیادی ضرورتیں وغیرہ تو اس سے منصوبہ بندی بڑھی۔ نئی ایجنسیاں قائم ہوئیں اور ہمارا خرچ بڑھا۔ نہ تو یہ مقاصد پورے ہوئے اور نہ کبھی ان مقاصد کی تکمیل میں ہونے والی ناکامی کا جائزہ لیا گیا البتہ ڈیویلپمنٹ بنک پلاننگ اینڈ ڈیویلپمنٹ انسٹیٹیوٹ' ایکسپینڈیچر سروسز' این جی او تنظیمیں وغیرہ قائم ہوگئیں۔ ان نئے اور روشن نظریات کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوکریاں' پیجارو جیپیں' خوبصورت گھر اور دیگر سہولتیں ان لوگوں کو مل گئیں جن کے پاس پہلے سے ہی بے شمار سہولتیں موجود تھیں اور سوائے عوام پر ٹیکس کے بوجھ میں اضافے کے اور کوئی تبدیلی نہ آسکی صرف نئے عائد کردہ ٹیکسوں سے حکومتی مفکروں کو مال و دولت میسر آ گئی اور عوام کی زندگیوں میں حکومت کی دخل اندازی بڑھ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اب نئی اصطلاح جو آجکل بہت استعمال ہو رہی ہے جسے enabling environment کہا جاتا ہے اس سے بہت خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصے میں ہم ایک نئی تنظیم ابھرتے ہوئے دیکھیں یا کم از کم کوئی اس طرح کی این جی او ہی قائم ہو جائے جیسے ''پاکستان انسٹیٹیوٹ آف دی انیبلنگ انوارنمنٹ'' (PIEE) جو ہمارے وسائل میں کمی کا باعث بن جائے۔ اس لئے میں ذیل میں کچھ تجاویز پیش کر رہا ہوں تا کہ ہم اپنی منزل کی صحیح طور سے نشاندہی کر سکیں۔

(الف) پیشہ ورانتظامیہ:

ابتداء میں ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ بدانتظامی' کرپشن اور ہمارے سول سروس کے نظام کی ناکامی کی ہمیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ ان کوتاہیوں کو دور کرنے کے لئے ہمیں ملک

کے لئے پیشہ ور انتظامیہ قائم کرنی پڑے گی اور موجودہ طبقہ اعلی سے تعلق رکھنے والا سول سروس کلب ختم کرنا پڑے گا کیونکہ ہمارے ہاں ضیاع کی سطح اس قدر بلند ہے کہ یہ کہنا صحیح ہوگا ہمارے ہاں انتظامی مسئلہ زیادہ اہم ہے نہ کہ وسائل کا مسئلہ۔

(I) نئی بھرتی:

موجودہ نظام کی بجائے کہ جس میں چیدہ چیدہ افراد پر انحصار کیا جاتا ہے ہمیں ایک نیا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے جس میں دنیا کے ہر علاقے میں رہنے والے پاکستانیوں کو حصہ لینے کا موقع فراہم کیا جائے۔ بھرتی ایک مسلسل عمل ہونا چاہئے اور ہر سطح پر اس کا ہونا ضروری ہے نہ کہ ایک ہی امتحان پاس کر لینے سے کوئی شخص بیوروکریٹ بن جائے۔ جس قدر ممکن ہو سرکاری شعبے اور نجی شعبے کے درمیان اس ضمن میں تبادلہ بھی ہوتے رہنا چاہئے اس سے مفادات کا تضاد تو جنم لے گا لیکن پھر بھی آجکل کے کرپشن کے مرض سے لاغر ہو گئے ہوئے نظام سے کہیں بہتر ہوگا۔

بھرتی کے نظام کا ایک بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ سول سروس کے تمام شعبوں میں اہل پیشہ ور لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں نہ کہ صرف سرکاری ملازمین ہی کو یہ مواقع دیئے جاتے رہیں۔ ایسی تقرریوں پر عوام کی نگرانی کا بھی بندوبست ہونا چاہئے۔ مثال کے طور پر سینئر پوزیشنیں جیسا کہ سیکرٹری وغیرہ کی تقرری پارلیمنٹ یا پارلیمنٹری کمیٹی کی مرضی سے ہونی چاہئے جو کہ کھلے عام بحث اور ماہرین کی آراء کے بعد ان کی تقرری کی سفارش کرے۔

(2) ترقی اور جوابدہی:

وقت کے ساتھ ساتھ یہ جانچے بغیر کہ کس نے کتنا کام کیا ترقی دے دینا جائز نہیں۔ پیداواری عمل میں شامل لوگوں کی رہنمائی کے لئے واضح اور مشتہر اصول بنائے جانے چاہیں۔ جنہیں آسانی سے وقت کے تقاضے کے مطابق بدلا جا سکے۔ ان اصولوں کو اہم آسامیاں پر کرتے ہوئے مدنظر رکھنا چاہئے۔ ہونے والی ترقی کی رپورٹیں وقتاً فوقتاً تیار کرتے رہنا چاہئے۔ اور میڈیا اور پریس کانفرنسوں کے ذریعے سے اس عمل کے بارے میں عوام کو بھی باخبر رکھنے کا اہتمام بھی کرنا چاہئے۔ شہریوں یا عوامی نمائندوں کا انتظامی امور میں شامل کر کے انفرادی یا محکمانہ ذمہ داری کو بہتر انداز میں اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک سینئر بیوروکریٹ پارلیمنٹ کے سامنے اپنے محکمے کی رپورٹ کو پیش

کرے جسے میڈیا کے ذریعے عوام تک بھی پہنچایا جائے۔

اپنی کارکردگی کو مذکورہ بالا طریقہ کار اختیار کر کے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اور متواتر اور اعلیٰ پائے کی تربیت کے ذریعے کارکردگی میں رہ جانے والی خامیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ کار کو اپنا کر اور دوسرے شعبوں سے ماہر لوگوں کی خدمات حاصل کر کے ہم اچھے افسر پیدا کر سکتے ہیں۔

(3) اہلیت کے مطابق اجرت:

سرکاری ملازمین کو اس قدر کم تنخواہ دے کر (الف) انہیں کرپشن کی دلدل میں پھنسنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے (ب) نسبتاً کم تعلیم یافتہ لیکن زیادہ مائل بہ کرپشن افراد سرکاری ملازمتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آجکل یہ افواہ بڑے زوروں پر ہے کہ سول سروس کے امتحان میں اچھے نمبر لینے والے کسٹمز سروس میں جانے کے خواہش مند ہوتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ روایتی ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ یا فارن سروس میں جائیں۔

دراصل سول سروس کے افسر کی ضروریات کا تجزیہ کرنا بہت ضروری ہے اور اس کا جائزہ لینا بھی کہ موجودہ نظام میں اس کی ضروریات کس حد تک پوری ہو رہی ہیں اور خاص طور پر اس کو دیئے جانے والے ریٹائرمنٹ الاؤنس وغیرہ پر بھی توجہ دینی چاہئے کہ آیا وہ کافی ہیں یا نہیں' عام خیال یہ ہے کہ ایک سرکاری ملازم کو اپنے بچوں کو تعلیم دلانے اور معقول انداز سے ریٹائرڈ زندگی بسر کرنے کے لئے اس سے بہت زیادہ درکار ہے جتنا اسے دیا جاتا ہے۔ عام تجربے کی بات تو یہ ہے کہ سول سروس کے افسر کو جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ صرف اس کے بچوں کی فیس کی ادائیگی ہی کے لئے کافی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ اگر چاہے کہ اس کے بچے بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کریں تو یہ ناممکن سی بات ہے اور جب وہ ریٹائر ہوتا ہے تو اسے ملنے والی پنشن اس قدر معمولی ہوتی ہے کہ وہ اس طرح کے گھروں کا کرایہ بھی ادا نہیں کر سکتا جس طرح کے گھروں میں اسے رہنے کی عادت ہوگئی ہوتی ہے۔ صاف ظاہر کہ ہم بیوروکریٹوں کی رشوت خوری کو اس لئے بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس تنخواہ میں گزارا کر ہی نہیں سکتا۔ اور اس سے بھی خطرناک بات یہ ہے کہ جب بہتر تعلیم یافتہ اور رشوت کی طرف مائل نہ ہونے والے نوجوان سول سروس جیسی ملازمت میں آنے سے گھبراتے ہیں تو رشوت ستانی کو معاشرتی سطح پر قبول کر لیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ طاقت اور پیسے کے بھنور میں پھنسے اس نظام کو خیر آباد کہہ دیا جائے اور اچھے جدید تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کو سرکاری شعبے کی ملازمین میں بھرتی کیا جائے۔ یہ تب ہی کیا جا سکتا ہے کہ سول سرونٹس کو صرف کیش میں معقول تنخواہ دی جائے اور کچھ نہیں۔ اور حکومت کو کاروں اور گھروں کے انتظامات کے چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہئے۔ ان خواہ مخواہ کی سہولتوں کا بیجا استعمال کیا جاتا ہے اور تنخواہوں کی نسبت بجٹ پر زیادہ بوجھ ان کی وجہ سے پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ایسا کوئی مطالعہ یا تحقیق نہیں ہو سکی جس سے پتہ چل سکے کہ ان سہولتوں کے باعث ٹیکس دہندہ پر کتنا غیر ضروری بوجھ پڑ رہا ہے۔ ہم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بیوروکریٹوں کی کاروں کو صحیح حالت میں رکھنے کے لئے زیادہ پیسہ خرچ ہو رہا ہے جو جلد بیکار ہو کر لوہے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی ہیں جبکہ نجی شعبے میں اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ زیادہ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ صلاحیتوں والے نوجوانوں کو اس ملازمت میں بھرتی کر کے اور انہیں کیش میں زیادہ تنخواہیں دے کر بہت سے ایسے افراد کو اس ملازمت میں آنے کی ترغیب دی جا سکتی ہے جو کرپشن کے بغیر اپنے کریئر کو بنانا سنوارنا چاہتے ہوں۔

(ب) حکومت کے حجم میں کمی:

حکومت کا حجم واضح طور پر بہت بڑھ گیا ہے اور اس کا رجحان مزید وسعت اختیار کرنے کی طرف ہے۔ ایسے منصوبے تواتر سے بنائے جاتے رہے ہیں جن سے حکومت کا حجم تو بڑھ جائے لیکن نتیجہ بیشک کچھ نہ دے پائے۔ آپ خواندگی اور آبادی میں اضافے کی طرف دیکھ سکتے ہیں جو کہ ہمیشہ منصوبوں کی زد میں رہے لیکن ان میں بہتری پیدا نہ ہو سکی حتیٰ کہ ہمارے ہاں بہت بڑے بڑے تعلیم کے محکمے ہیں اور کافی تعداد میں آبادی کے سیل بھی قائم کئے گئے ہیں۔

ہمیں نہ صرف منصوبہ بندی کو مکمل طور پر خیر باد کہہ دینا چاہئے۔ علاوہ ازیں حکومتی اداروں کا آڈٹ کر کے ان اداروں کو بند کر دینا چاہئے۔ جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ مثال کے طور پر ہم نے ادبی اور ثقافتی ادارے کیوں کھول رکھے ہیں جو کہ سرکاری امداد سے چلتے ہیں اور 40 ادنیٰ معیار کی یونیورسٹیوں کو قائم کرنے کا کیا جواز ہے؟ اور ہمارے پاس اتنی بڑی تعداد میں تحقیقی مراکز کیوں ہیں جن میں کسی قسم کی تحقیق نہیں ہو رہی؟ حکومتی ایجنسیوں کو کم کرنے کی ضرورت ہے بلکہ سرکاری ملازمین کی تعداد کو بھی خاصی حد تک کم کرنے کی ضرورت ہے۔

(ج) معاہدوں کا نفاذ:

حکومت کی بنیادی ذمہ داری وہ ہے جو کہ اب اس کی ترجیحات کی فہرست میں بہت نیچے جا پہنچی ہے اور وہ ہے شہریوں کے لئے ایسا فریم ورک مہیا کرنا جس کے اندر رہ کر وہ کاروباری سودے کر سکیں۔اس لئے کم از کم ایک معقول حد تک مکمل مجموعہ قوانین کی ضرورت ہوتی ہے جسے محکمہ انصاف اور عدالتیں نافذ کرتی ہیں چونکہ معاشی سرگرمیوں کی بنیاد معاہدوں پر ہوتی ہے چنانچہ یہ بہت اہم ہوتا ہے کہ ان معاہدوں کا نفاذ قانونی نظام کے تحت ہو۔

اس لحاظ سے ہم خوش قسمت تھے کہ ہمیں بہت اچھا قانون کا نظام انگریزوں سے ورثے میں ملا لیکن ہم نے اسے زوال پذیر ہونے دیا۔اب ہمیں اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ جلد انصاف میسر ہو سکے اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے لئے بھی انہی اصولوں کو اپنانا ہوگا جن کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے۔اس انداز میں انہی طرح کے لوگوں کو محکمہ انصاف اور پولیس میں بھی بھرتی کرنا ہوگا تا کہ ان کی کارکردگی بہتر ہو سکے۔

اس کے باوجود حفظ ماتقدم کے طور پر ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اگر چہ عدالتی نظام کے کردار پر بہت زور دیا جاتا ہے گو کہ یہ بہت اہم ہے لیکن سب سے زیادہ اہم حکومت کے کردار میں کمی ہے۔ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ نجی شعبے میں ساکھ اور نیک نامی عموماً وہ کام کر جاتی ہے کہ جو دیگر حالات میں عدالتیں کرتی ہیں۔مثال کے طور پر باڑہ کو لے لیجئے جہاں حکومتی قانون یا تہذیب کی پہنچ نہیں لیکن آج تک ایسی بات کبھی سنائی نہیں دی کہ معاہدہ کیا گیا ہو اور اسے پورا نہ کیا گیا ہو۔یہی کچھ ہنڈی مارکیٹ کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔اور یہ بھی ہمارے قانون کی پہنچ سے باہر اپنا وجود رکھتی ہے۔اور جہاں تک ہمارے شہری مراکز کا تعلق ہے جہاں حکومتی قوانین اپنے پورے طمطراق کے ساتھ اپنا وجود رکھتے ہیں معاشی قواعد وضوابط بھی ہوتے ہیں لیکن پھر بھی یہاں مجرموں کو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اور ساکھ اور نیک نامی بے اثر ہے بے ایمان اقتدار کے ایوانوں میں دندناتے پھر رہے ہیں۔

نتیجہ

آجکل کی ترقیاتی سوچ ترقی کو ممکن بنانے کے لئے اپنا پورے کا پورا انحصار حکومت پر کئے ہوئے ہے یہ سوچ رکھنے والے مفکرین ابھی بھی حکومت ہی سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ عوام کے لئے قوانین وضوابط بنائے اور صحت وتعلیم کے نظام کو بہتر بنا کر انسانی ذرائع کی ترقی کو یقینی بنائے۔ایک اہم سوال جو کہ ان لوگوں کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے کہ ''کیا حکومت اپنے ضرورت سے زیادہ

بڑے حجم اور کرپٹ طور اطوار کے ساتھ کوئی بھی ترقیاتی کام کرنے کے قابل ہے؟ یا کیا حکومت کو مزید ذمہ داریاں سونپنے سے محض کرایہ طلبی کے رجحان میں اضافہ نہ ہوگا؟ کیا ہمیں ڈاکو اور لٹیرے کی سربراہی کو قبول کر لینا چاہئے؟ آج ہمیں برنکس (Brinks) جیسی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں تا کہ وہ ہماری حفاظت کریں اور حفاظت بھی پولیس سے کریں جو چوروں' نقب زنوں اور قبضہ گروپوں کی پشت پناہی کرتی ہے۔ غالباً اب وقت آن پہنچا ہے کہ ہم حکومت کی بجائے اپنے آپ پر انحصار کرنا شروع کر دیں۔

(34)

یونیورسٹی کی اصلاح کے لئے ایک تجویز!

پنجاب یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر کو مشورے

پنجاب یونیورسٹی جو کہ برس ہا برس سے مسائل میں گھری ہوئی ہے اب وزیراعظم نے اسے سدھارنے کے لئے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ نئے وائس چانسلر کی تلاش بھی جاری ہے اور خیال یہ ہے کہ کسی ریٹائرڈ بیوروکریٹ کو یہ ذمہ داری سونپی جائے گی۔ عام طور پر کسی بھی اچھے اور سنہری روایات کے حامل یونیورسٹی سسٹم میں کسی بہت ہی اہل اور پڑھے لکھے ماہر علم ونصاب کو یہ مقام دیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری یونیورسٹیوں میں زوال اور ابتری نے اس قدر غلبہ پالیا ہے کہ تمام یونیورسٹیوں کا کوئی شعبہ اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا مزید برآں اب اچھے ماہرین تعلیم چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ علاوہ ازیں اب جو کوئی بھی وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالے گا اسے بیوروکریسی اور انتظامیہ کے تعاون کی شدید ضرورت ہوگی اس لئے قیاس ہے کہ کوئی ریٹائرڈ بیوروکریٹ جس کا خاصا اثر ورسوخ ہو اسے یہ عہدہ سونپا جائے گا۔

اگر پاکستان میں نظام تعلیم کو سدھارنا مقصود ہے تو پنجاب یونیورسٹی کی اصلاح اس ضمن میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگی۔ اگر ہمارے ملک میں کوئی ایک بھی ایسی یونیورسٹی ہو جس کا معیار صنعتی ممالک کی ادنی یونیورسٹیوں جتنا بھی ہو تب بھی ہم سکول اور کالجوں کے لئے اچھے اساتذہ پیدا کر سکتے ہیں ایسے سکول اور کالج جن کی جدید تعلیم کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے تعلیمی نظاموں کا جائزہ لینے سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جائے گی کہ اگر یونیورسٹیوں میں تعلیم وتحقیق کا معیار بلند کر دیا جائے تو اس کا مثبت اثر نظام تعلیم کے تمام شعبوں پر پڑے گا اور تعلیمی معیار بلند ہو جائے گا جو کہ ملک کی معاشی سیاسی اور معاشرتی ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

نئے وائس چانسلر (پنجاب یونیورسٹی) اگر کوئی بامقصد کام کرنا چاہتے ہیں اور پیش رو

حضرات کی طرح محض اقتدار اور سہولتوں ہی کو استعمال میں لا کر عیش و آرام کرنا ہی ان کا مقصد نہیں تو انہیں یونیورسٹی میں ایک ایسا انتظامی نظام نافذ کرنا چاہئے جس سے پنجاب یونیورسٹی تیزی سے ایک اعلیٰ اور معروف تعلیمی مرکز میں تبدیل ہو جائے بالکل ان اداروں کی طرح جس طرح کے ادارے ہمیں ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں دکھائی دیتے ہیں۔ اگر وہ ہارورڈ' آکسفورڈ اور ایم آئی ٹی وغیرہ کے نظام ہائے تعلیم کا مطالعہ کرتے ہیں اور پنجاب یونیورسٹی کی بھی انہی خطوط پر تنظیم نو کرنا چاہتے ہیں تو انہیں درج ذیل اقدامات کرنا پڑیں گے۔

1- حقیقت پسندانہ اور بامعنی فیسوں کا نظام:

ہر ملک میں یونیورسٹی کی تعلیم نسبتاً متمول طبقے کے افراد حاصل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو 20 برس سے پہلے کی عمر تک غربت کی سرحدوں سے نکل جاتے ہیں تو انہیں ملک کے نچلے طبقے کا رکن نہیں مانا جاتا۔ ایسے بہت سے طلباء و طالبات جو پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ پرائیویٹ سکولوں میں بھاری فیسیں دیتے رہے ہونگے حتی کہ انہوں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا جہاں فیس سراسر تکلف ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ ہم امیر طبقے کے بچوں کو رعایتی فیس لے کر تعلیم دے رہے ہیں البتہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ فیس کو بڑھا دیا جائے اور مستحق اور غریب طلباء کے لئے وظائف دیئے جائیں۔

فیسوں کو بڑھانے کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ طلباء سنجیدگی سے تعلیم کی طرف توجہ دیں گے اور والدین کی بھی خواہش یہی ہوگی کہ انہیں ادا کردہ رقم کی قیمت وصول ہو (ان کے بچوں کو معیاری تعلیم دیجائے اور وہ آوارہ گردی کی بجائے تعلیم پر توجہ دیں) آج کل والدین دو اصولوں پر یقین کئے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''آپ کو وہی کچھ ملتا ہے جتنا آپ خرچ کرتے ہیں'' اور ''اگر آپ اپنے بچے کا مستقبل بنانا چاہتے ہیں تو اسے تعلیم کے لئے باہر بھیجیں اور پنجاب یونیورسٹی سے احتراز کریں'' اگر فیس زیادہ کی جائے گی تو طلباء اور والدین دونوں اعلیٰ معیار کی تعلیم کا مطالبہ کریں گے۔ تب وہ امتحانوں میں ہونے والی تاخیر اور امتحان اور نتیجے کے درمیان لمبے وقفے کو بھی برداشت نہیں کریں گے اور اساتذہ کو ایسے تعلیمی پروگرام تشکیل دینے پڑیں گے کہ جن سے طلباء اور والدین کو تشفی ہو سکے۔

2- معیاری اور معقول تنخواہ دار اساتذہ کی فراہمی:

کسی بھی تعلیمی ادارے کا سب سے قیمتی اثاثہ معیاری اساتذہ ہی ہوتے ہیں۔تمام بڑی بڑی بین الاقوامی یونیورسٹیاں ہر وقت اسی کوشش میں مصروف رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اچھے اساتذہ کو اپنی طرف مائل کر سکیں اور پھر ان کے قیام کو طول دیتے رہیں۔ جب بھی اچھے استاد سے بات کی جاتی ہے تو اسے راضی کرنے کے لئے اس کی تنخواہ، سہولتیں اور تحقیق کے لئے دی جانے والی گرانٹ وغیرہ سب میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔کئی مثالیں تو ایسی بھی ہیں کہ کسی شعبے میں کسی نامی گرامی پروفیسر کو لانے کی کوشش میں اس کی بیوی کو بھی نوکری کی پیشکش کی گئی۔جلدی ترقی اور دیگر سہولتیں ہمیشہ لائق اور باصلاحیت پروفیسروں کا مقدر بن جاتی رہی ہیں۔اعلی پائے کے پروفیسروں کو وائس چانسلر سے بھی زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے اور وہ وائس چانسلر کو جوابدہ بھی نہیں ہوتے۔ پروفیسروں کو سالوں تک 18 اور 19 گریڈ تک ہی محدود رکھنا بہت بڑی زیادتی ہے انہیں نہ تو ترقی کی امید ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں اپنے گریڈ کے حساب سے وہ سہولتیں ملتی ہیں جو کہ اسی گریڈ کے سول سرونٹ کے لئے مخصوص ہیں تو ایسے میں بہترین لوگوں کی ترجیح محکمہ تعلیم تو یقیناً نہیں ہوگی۔تب ہمیں بھی یہ امید نہیں کرنی چاہئے کہ ایک شخص پی ایچ ڈی کے لئے اتنی محنت اور دولت صرف کرے اور تب بھی 20ویں گریڈ سے اوپر نہ جا پائے جبکہ اس کے طلباء 22ویں گریڈ تک جا پہنچیں جب کہ ان کی تعلیم بھی صرف بی اے ہو۔ان حالات میں اہل لوگ تعلیمی اداروں میں پڑھانا کیونکر پسند کریں گے۔

ہمیں امریکی یونیورسٹیوں کے نظام کی پیروی میں مخصوص مدت (Tenure) کا نظام اپنے ہاں رائج کرنا چاہئے۔نوجوان ماہرین تعلیم کو اپنے چھپے ہوئے مقالہ جات کے زور پر خالی نشست کے لئے مقابلہ کرنا پڑتا ہے تا کہ وہ یونیورسٹی میں پڑھا سکیں۔فیکلٹی ریکروئمنٹ کے موجودہ نظام میں بہت سی خامیاں ہیں۔کیونکہ ہم ہر سال اپنے ماہرین تعلیم مغربی دنیا کے حوالے کر دیتے ہیں جو واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔مزید یہ کہ کسی بھی پروفیسر کو تحقیق کا کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔دلچسپی کی بات یہ بھی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے کسی شعبے میں کبھی کوئی سیمینار نہیں ہوا جبکہ باہر کی بڑی یونیورسٹیوں میں ہر ہفتے بہت سے سیمینار ہوتے ہیں اور ان یونیورسٹیوں کے تقریباً تمام شعبے صبح سے شام تک تدریس کا کام کرتے ہیں اور طلباء رات گزر جانے کے بعد تک لائبریریوں میں بیٹھے کام کرتے رہتے ہیں جبکہ پنجاب یونیورسٹی دوپہر ہی کو ویران ہو جاتی ہے۔

3- فیصلہ کرنے کی آزادی:

اعلیٰ پائے کی یونیورسٹیوں میں نصاب، سٹاف کی تقرری اور مضامین کے انتخاب میں عدم مرکزیت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اور یہی اس سطح کی تخصیصی تعلیم (Specialized Education) کا طریقہ کار ہونا بھی چاہئے۔ اس زمانے میں یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ مرکزی نوعیت کی کمیٹی، فزکس، کیمسٹری، سوشیالوجی، بیالوجی اور اکنامکس وغیرہ کے پروفیسروں کی کارکردگی کو کیسے جانچ لیتی ہیں یا تقرری کیسے کر لیتی ہے۔ ایک ہی کمیٹی اس قدر مختلف شعبوں کی کارکردگی کا صحیح اندازہ کیسے کر لیتی ہے۔ نئے وائس چانسلر کو ہر شعبے کے لئے اچھے پروفیسروں کو مقرر کرنا چاہئے اور اپنے برابر مقام دینا چاہئے اور کئی بنیادی فیصلے فیکلٹی پر ہی چھوڑ دینے چاہیں۔ یونیورسٹی کی اصلاح کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ وہاں کے موجود سٹاف کی اکثریت سے چھٹکارہ پالیا جائے اور تازہ اور باصلاحیت افراد کو تدریس کی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔

4- تحقیق پر زور دینے کی ضرورت:

یونیورسٹی کے موجودہ نظام پر نظر دوڑانے سے اندازہ ہوگا کہ اس کا 80 فیصد خرچ انتظامی امور پر آتا ہے جبکہ اس کے ملازمین کا 95 فیصد حصہ انتظامیہ سے متعلق ہے۔ نہ تو وہاں تحقیق کے لئے فنڈز ہیں نہ ہی کوئی ترغیب! شائد ہی یونیورسٹی کا کوئی استاد ایسا ہو جس کا کوئی مقالہ بین الاقوامی شہرت کے جریدے میں کبھی چھپا ہو یا کوئی کسی جرنل کے ادارتی بورڈ کا رکن ہو۔ یہ بات تو بہت عام ہے کہ یونیورسٹی کا مقتدر طبقہ ایسی علمی سرگرمیوں جیسے کسی جرنل وغیرہ کے لئے مقالہ تحریر کرنا وغیرہ سے بالکل لاتعلق ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ تحقیق کے لئے رقوم مختص کی جائیں اور ایسے قوانین بنائے جائیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے منتظمین پروفیسروں اور ان کی تحقیق پر انحصار کریں۔

اس منصوبے کو نافذ کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی اس ضمن میں بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے تعاون بھی حاصل کر سکتی ہے۔ ابتداء میں وائس چانسلر تعاون کرنے والی یونیورسٹیوں سے تقرری، ترقی، نصاب کا انتخاب اور شعبہ جات کے دیگر فیصلوں سے متعلق معاہدہ کر سکتے ہیں یونیورسٹی کے مقام میں اضافہ کرنے کے لئے امداد دینے والی ایجنسیوں سے کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ معاوضے کے عوض یہاں چیئرز قائم کی جائیں ان پر تقرری باہر کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہی کریں گی۔ اس کے باوجود حکومت کو فیس بڑھانے کی کڑوی گولی تو نگلنی پڑے گی ذاتی مفادات کے حامل افراد سے چھٹکارا پانا ہوگا اور اصلاح کے عمل کو سنجیدگی کے ساتھ جاری رکھنا ہوگا جو یقیناً سندھ میں امن وامان کے مسئلے کو حل کر دینے سے کم مشکل قطعاً نہیں ہے۔

(35)

آیئے زراعت کو عقلی بنیادوں پر استوار کریں!

آیا زراعت پر ٹیکس عائد کرنا چاہئے یا نہیں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو جذباتی مباحثے کا باعث بنتا رہتا ہے۔ بہت سے معروف معاشیات دان اور زمیندار طبقے کے نمائندے اس بات پر مصر ہیں کہ زراعت پر ٹیکس نہیں لگنا چاہئے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ زراعت پر پہلے ہی سے کافی زیادہ بوجھ ہے کیونکہ حکومت نے زرعی اجناس کی قیمتوں کو بہت زیادہ کم کیا ہوا ہے۔ زرعی اجناس کی قیمتیں بین الاقوامی منڈی کے مقابلے میں بہت کم ہیں اور ایسا انتظامی احکامات کے ذریعے سے کیا گیا ہے۔ زراعت پیشہ افراد سے اس طرح مخفی طور پر ٹیکس لے لیا جاتا ہے کہ زرعی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہونے دیا جاتا۔ اور یہ ٹیکس بہت زیادہ ہوتا ہے بعض اوقات تو کہا جاتا ہے کہ یہ ٹیکس کل پیداوار کا 50 سے 60 فیصد ہوتا ہے۔ یہ اعداد و شمار کہاں سے آئے ہیں اس کا ہمیں علم نہیں۔ یقیناً یہ حضرات اس مسئلے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور یہ قابل اعتبار ہرگز نہیں۔

زراعت کے شعبے میں ٹیکس متعارف کرانے کے نقصانات کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اس سے کسان زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں گے اور کھیتی باڑی چھوڑ کر شہروں میں آن بسنے کو ترجیح دینگے۔ لیکن اگر کسانوں اور زراعت پیشہ افراد پر پہلے ہی اتنا بوجھ ہے اور ان کے ساتھ قرضوں کے حصول کے ضمن میں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے تو وہ پہلے ہی سے زراعت کو چھوڑ کر شہروں کا رخ کیوں نہیں کر لیتے؟ کیا تھوڑا سا مزید ٹیکس کا بوجھ ڈال دینا اونٹ کی کمر پر آخری تنکہ ہوگا؟ کیا وہ صرف براہ راست ٹیکس ہی کا انتظار کر رہے ہیں کہ اس کے لاگو ہوتے ہی وہ زراعت چھوڑ دیں؟ کیا مذکورہ بالا باتیں سچ تسلیم کی جاسکتی ہیں؟

اگر زراعت پیشہ لوگوں پر ٹیکسوں کا بوجھ پہلے ہی بہت زیادہ ہے جیسا کہ بتایا جاتا ہے تو حالیہ برسوں میں پاکستان میں گندم اور کپاس کی پیداوار اتنی زیادہ کیونکر ہوئی؟ اور کسان گندم اور کپاس کی بجائے سبزیاں اور پھل کیوں نہیں اگاتے جن پر حکومت نے پرائس کنٹرول لاگو نہیں کیا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر آجکل کی زرعی لابی کے نمائندوں کو محتاط طریقے سے غور کرنا چاہئے۔

سرسری سا جائزہ لینے پر بھی یہ اعداد وشمار غلط دکھائی دینے لگتے ہیں۔ کبھی کوئی بڑا زمیندار بھوکا مرتا ہوا دکھائی نہیں دیا یا غربت کی وجہ سے اس نے اپنی زمین نہیں بیچی۔ اس کے بالکل برعکس وہ پارلیمنٹ کے ایوانوں میں ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو پیجارو جیپوں پر سفر کرتے ہیں اور ''روٹی'' کپڑا اور مکان'' کی پریشانیوں سے آزاد ہیں۔ یہ پریشانیاں صرف ہم جیسے لوگوں کے لئے ہیں۔

ہم سب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زرعی اجناس کی قیمتیں بین الاقوامی سطح سے بہت کم ہیں اور یہ بھی مدنظر رکھنا چاہئے بیج اور کھاد وغیرہ کی قیمتوں میں بھی زراعت پیشہ افرد کو رعایت دیجاتی ہے۔ اس نظام کی وجہ سے زراعت کچھ ٹیکسوں کی زد میں آ جاتی ہے اور ٹیکس دہندہ پر بوجھ بھی پڑتا ہے۔ حال ہی میں پاکستان جرنل آف ایگریکلچرل اکنامکس نے اعداد وشمار کی مدد سے بتایا ہے کہ بالواسطہ ٹیکس کے اس نظام کی بدولت پوری زرعی پیداوار کے 5 فیصد پر ٹیکس عائد ہوتا ہے جو اعداد وشمار زمینداروں اور جاگیرداروں کے نمائندے فراہم کرتے ہیں ان میں کوئی صداقت نہیں۔

موجودہ پالیسی کے مضراثرات

جبکہ موجودہ نظام زراعت پیشہ افرد پر بالواسطہ ٹیکس لاگو کرنے میں تو کامیاب ہے لیکن زرعی ریونیو سرکاری خزانے میں نہ ہونے کے برابر داخل ہوتا ہے۔ اور نہ ہی یہ نظام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ صحیح پیداواری فیصلے کئے جائیں۔ زراعت پیشہ افراد منافع کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ انہیں کیا چیز کاشت کرنی چاہئے اور کیا نہیں اور جہاں تک منافع کے تعین کا تعلق ہے تو یہ قیمت کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اس طرح قیمت کسانوں اور کاشتکاروں کو یہ تعین کرنے پر آمادہ کرتی ہے کہ کیا چیز کاشت کرنی چاہئے اور کونسی چیز کو نظر انداز کرنا چاہئے؟ اور اگر ''قیمت'' کا تعین منڈی کرتی ہے تو صارفین کی ترجیحات کاشتکاروں کے فیصلوں کا تعین کرتی ہیں۔ اگر قیمتوں کے تعین کا کام حکومت کرتی ہے تو یہ فیصلہ کوئی بیوروکریٹ ہی کرے گا کہ کسان کو کونسی فصل کاشت کرنی چاہئے اور کونسی فصل سے اجتناب برتنا چاہئے' نیز صارفین کو کیا خریدنا چاہئے اور کیا نہیں۔

سوویت یونین کو ٹوٹتے ہم سب نے دیکھا ہے وہاں بھی بیوروکریٹ ہی صارفین پر اپنی مرضی ٹھونستے تھے۔ شاید اپنے وقت کے اس عظیم ملک کا زوال ہم پر یہ واضح کر سکے کہ حکومت کے

قیمتوں کے کنٹرول کرنے کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہاں زراعت کے حوالے سے واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ حکومت کی مداخلت سے گنے کی پیداوار بہت متاثر ہوئی گنے کی پیداوار میں ہم مقابلہ کرنے کے اہل نہیں اور اس ضمن میں اس کی قیمت رعایتی رکھی گئی تا کہ بعض اثر ورسوخ رکھنے والے مل مالکان کو فائدہ پہنچ سکے۔

ضروری اصلاحات

اب ہمارے معروف معاشیات دانوں کو ہماری زرعی پالیسی مکمل طور پر اصلاح کرنے کی طرف دھیان دینا چاہئے۔ اس میں انہیں حکومت کے زراعت پر کنٹرول کو ختم کرنا ہوگا نیز حکومت کے قیمت کے تعین کی پالیسی کا بھی خاتمہ وقت کی اشد ضرورت ہے۔ مزید برآں زرعی انکم ٹیکس کے نفاذ کو بھی یقینی بنانا چاہئے۔ کسانوں کو منڈی سے صحیح اور واضح اشارے ملنے چاہیں اور موجودہ حکومتی کنٹرول کی پالیسی سے چھٹکارہ پانا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رعایت (Subsidy) کو ختم کر کے براہ راست ٹیکسوں کا نفاذ کیا جائے تا کہ اس کی وصولی شفاف طریقے سے ممکن ہو سکے۔

موجودہ نظام کے خاتمے کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ موجودہ نظام کے تحت جو بجٹ میں سے رقوم مختص کی جاتی ہے وہ بچا لی جائیں گی اور اگر منڈی کے ذریعے سے متعین ہونے والی فصلوں کی قیمتیں زیادہ ہوئیں تو فصلوں کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ اس گنجلک نظام کو تبدیل کئے بغیر بھی اگر قیمتوں میں 10 فیصد اضافہ ہو تو اوسطاً پیداوار 6 فیصد بڑھے گی۔ (اگر مہیا کئے گئے اعداد وشمار اور اندازوں پر یقین کر لیا جائے)

اگر ہم زیادہ سے زیادہ ملکیت زمین کی حد کو ختم کر دیں اور زراعت کو صنعت کی طرح ہی آزادی دے دیں جیسے کوئی بھی فرد جتنی بھی ملیں چاہے رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی فرد جتنی اس کے لئے ممکن ہوگی زمین اپنی ملکیت میں رکھ سکے گا۔ تو زیادہ محنتی اور اہل کاشتکار زیادہ زمین کا مالک بننے کے قابل ہو جائے گا۔ اور اگر ان کاشتکاروں کے لئے یہ ممکن بنا دیا جائے کہ وہ جس قدر زمین چاہیں اپنی ملکیت میں لے لیں تو پیداوار بھی بڑھے گی کیونکہ زمین نااہل کاشتکاروں کے ہاتھوں سے نکل کر محنتی اور اہل کاشتکاروں کو منتقل ہو جائے گی۔

زراعت پر براہ راست ٹیکس کے نفاذ کے خلاف ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس سے

متوقع آمدنی زیادہ نہ ہوگی۔لیکن پھر بھی موجودہ نظام کو بالکل ختم کر دینے سے زمین سے حاصل ہونے والی زرعی آمدنی بڑھے گی۔اوراس بڑھی ہوئی آمدنی پر براہ رست ٹیکس نافذ ہوگا جس سے ملکی وسائل میں اضافہ ہوگا۔

(36)

سول سروس کی اصلاح

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ سول سروس کی اصلاح کی ضرورت پر اس وقت سے بات ہوتی آ رہی ہے جب میں چھوٹی عمر کا لڑکا تھا تو میں نے اپنے ایک کزن سے جو کہ آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہو کر آیا تھا سول سروس کی اصلاح سے متعلق پہلی مرتبہ سنا۔ میں اس کے دلائل اور انصاف اور معاشی ترقی کے لئے جذبے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ تقریباً انہی دنوں ایک لائق فائق شخص نے جو اب پیپلز پارٹی کے بڑے رہنما ہیں سول سروس کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور ایک بیان میں سول سروس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس میں اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے بعد میں نے یہی دیکھا کہ یہ دونوں حضرات معاشرے میں اعلیٰ مقام تک پہنچے جبکہ دوسری طرف سول سروس میں بہتری نہیں آ سکی۔ میرے خیال میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پاکستانیوں کی اکثریت یہی سمجھتی ہے کہ ہماری آزادی کے دنوں کے بعد سے سول سروس میں تنزلی آئی ہے۔ بہت سے لوگ جن سے میں نے بات کی وہ اتفاق کرتے ہیں کہ سول سروس میں شدید تنزل آ چکا ہے۔

اب اگر میں آپ کو یہ تاثر دوں کہ سول سروس کی اصلاح کے مسئلے نے ہمارے دانشوروں کی توجہ کافی عرصے سے اپنی طرف مبذول کرائے رکھی تو یہ غلط بات ہوگی۔ دراصل یہ مسئلہ ہمارے ملک کے دانشورانہ حلقوں میں کبھی بھی زیرِ غور نہیں آیا شائد اس لئے کہ دانشور اس سے کہیں زیادہ اہم مسائل کو سلجھانے میں مصروف رہے۔ اگر کوئی غور کرے کہ وہ کس قسم کے موضوعات یا مسائل ہیں جو میڈیا کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں یا کن موضوعات پر لکھی گئی کتاب دھڑا دھڑ بک جاتی ہے تو پتہ چلے گا کہ یا تو شاعری کی کتابیں یا اقبال اور فیض کی شاعری پر تبصرے' خارجہ پالیسی' کسی نئے ''ازم'' کی تلاش کے بارے میں کوئی کتاب یا پھر افغانستان کے مسئلے پر لکھی گئی کتابیں

قارئین کی توجہ کا زیادہ مرکز بنتی ہیں اور پاکستانی کے انتظامی مسائل کہ جن سے ہماری زندگیاں براہ راست متاثر ہورہی ہیں ان پر نہ تو کوئی گفتگو کرنے کے لئے تیار ہے اور نہ ہی لکھنے پر۔

جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی تو مجھے یہ پتہ چلتا گیا کہ تمام دانشور اور سیاستدان انتظامی مسائل کے موضوع میں اسی قدر لچسپی رکھتے ہیں جس کے طفیل انہیں اس نظام کا حصہ بن جانے میں مدد مل سکے۔ ان کے دلائل اگرچہ زوردار قسم کے ہوتے ہیں لیکن ماہیت کے اعتبار سے ان میں کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب کبھی نظام کے یہ نقاد اعلی عہدوں تک جا پہنچیں یا اثر ورسوخ حاصل کرلیں تو وہ سیاست کے کھیل میں اتنے مصروف ہوجاتے ہیں کہ انہیں پبلک ایڈمنسٹریشن پر غور کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ان کے لئے مسئلہ کشمیر، ویت نام اور افغان جنگ زیادہ اہم اور دلچسپی کی حامل ہوتی ہے۔

اصلاحات کے لئے تجاویز:

آجکل پالیسی سازوں کے خیال میں سول سروس کے دو اہم مقاصد ہیں جنہیں اسے سرانجام دینا ہے۔

(الف) ان ایمپلائمنٹ انشورنس سکیم کی فراہمی

(ب) سیاسی نوازشات کے لئے ایک ذریعے کے طور پر کام کرنا۔

ان مقاصد کے ہوتے ہوئے سول سروس سے کم ہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عوام کے لئے کوئی خدمت سرانجام دے۔ اور یہ خیال تو محض خیال خام ہی ہے کہ ٹیکس دہندہ کو کوئی سول سرونٹ کسی قسم کی سہولت بہم پہنچائے دراصل وہ عوام کی خدمت کے لئے تو نوکری میں نہیں آیا وہ تو حکومت کرنے آیا ہے۔

مذکورہ بالا مقصد کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ حالیہ برسوں میں نجی شعبے کی تنخواہ افراط زر کی شرح کے مقابلے میں کم ہوتی رہی ہے اور سرکاری شعبے کے ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ حکومتی حلقوں نے کوشش کی کہ وہ حکومت کو ایک بے ضرر اور اخراجات میں اعتدال برتنے والے ادارے کے طور پر پیش کریں۔ لیکن حقیقت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ حکومت سب کو نوکریاں بھی دے دیتی ہے لیکن تنخواہ انتہائی کم دیتی ہے۔ بہرحال حکومت اپنے پراپیگنڈے اور نعرہ بازی کی آڑ میں چنیدہ شعبوں کے ملازمین (سول سروس) کی سہولتوں میں اضافہ کرتی ہے اور ساتھ ہی کرپشن کی طرف سے بھی آنکھیں بند کرلیتی ہے حتی کہ آجکل کرپشن عام ہوگئی ہے اور معاشرے

میں اسے قطعاً برا نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ بعض نوکریوں میں (پولیس اور کسٹمز وغیرہ) تو بولیوں کے ذریعے سے پوسٹنگ کرائی جاتی ہے۔

جونہی تنخواہ کم اور کرپشن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے سرکاری شعبے کی اہلیت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ تنزلی ایک تو اس وجہ سے ہوتی ہے کہ سول سرونٹ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ جن سے مال و دولت اکٹھا کر سکے اور دوسری وجہ یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد جو پیشہ وارانہ ذہنیت رکھتے ہوں اور کرپشن کی طرف مائل نہ ہوں وہ اس طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب زیادہ کرپٹ اور نااہل افراد اہم پوزیشنوں پر فائز ہوں تو وہ کم کرپٹ اور اہل لوگوں کو نکال باہر کرتے ہیں اس سارے عمل کا نقصان شہریوں ہی کو ہوتا ہے کیونکہ وہ سول سرونٹس کے ہاتھوں صرف ذلیل وخوار ہی ہوتے ہیں۔

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سول سروس کی اصلاح وقت کی اہم ضرورت ہے اور انتظامی نظام نیز اس سے متعلق افراد میں بہتری لانا ہوگی۔ اور اس مقصد کے لئے ہمیں نجی شعبے سے ہر آن اور ہر لمحہ سبق سیکھتے رہنا ہوگا۔ سول سروس کو ان پروفیشنل افراد کی خدمات حاصل کرنا ہونگی جن کا اخلاقی کردار بے داغ ہو۔ اس کے لئے انہیں نجی شعبہ سے مقابلے کی فضاء کو رواج دینا ہوگا۔ سول سروس کے ملازمین کی تنخواہیں بڑھانی ہونگی اور نجی شعبے سے اعلیٰ پائے کے افراد کو ترغیب دینی ہوگی اور اس پر بھی دھیان دینا ہوگا کہ ان افراد کی نجی شعبے کو ضرورت ہے یا نہیں۔

سول سروس میں ملازمت کے حصول کے لئے عائد شرائط کو بھی ختم کر دینا چاہئے تاکہ معیشت کے تمام شعبوں سے افراد مقابلے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر سکیں۔ نیز تنخواہ کا پیکج بھی ایسا ہونا چاہئے کہ بہترین افراد اس ملازمت کی طرف رجوع کریں۔ اور معاوضہ صرف کیش میں ہونا چاہئے بقیہ سہولتیں ختم کر دینی چاہیں جیسے کاریں، گھر نوکر چاکر وغیرہ۔

معقول تنخواہیں اور دلکش کیریئر جس میں سرکاری ملازمت اور نجی شعبے کا آپس میں (افراد کا) تبادلہ بھی ممکن ہو سکے تو افراد اور تنظیم کے اعتبار سے سول سروس میں بہت ترقی آ سکے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا نظام بھی تشکیل دینا ہوگا جو سول سروس کی پیداواری صلاحیت کو جانچ سکے اور سول سرونٹس کا ضرورت پڑنے پر موازنہ کیا جا سکے۔ کسی بھی فرد کی سول سروس میں بھرتی کے وقت اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً میڈیا اور پبلک کے ذریعے سے ہی اس کی صلاحیتوں کو پرکھا جانا چاہئے۔ مثال کے طور پر ڈپٹی کمشنر یا کمشنر مقرر کرتے وقت صوبائی اسمبلی کی سب کمیٹی کے ذریعے

اس کی صلاحیتوں کو پرکھا جانا چاہئے۔اسی طرح کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں سے ہر سال امن وامان کی صورتحال پر رپورٹ پیش کرنے کو کہا جانا چاہئے اور یہ حضرات کھلی پریس کانفرنس یا پبلک میٹنگ میں یہ رپورٹ پیش کریں تا کہ انہیں عوام کے ردعمل سے نظام میں مناسب تبدیلی لانے کا موقع مل سکے۔

موجودہ نظام میں کرپشن کے بڑھنے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کے بہت بڑے وسائل سول سرونٹس کے کنٹرول میں دے دیئے گئے ہیں مزید یہ کہ انہیں ہماری زندگیوں پر بھی ضرورت سے زیادہ اختیار دے دیا گیا۔اب ایک تسلسل کے ساتھ یہ کوشش کی جانی چاہئے کہ یہ کنٹرول جو حکومت کے ہاں مرتکز ہوگیا ہے اسے واپس شہریوں کو منتقل کیا جاسکے۔سب سے اہم بات جو اس تصنیف کے دوران بار ہا کہی گئی ہے کہ حکومت کے حجم کو کم کئے بغیر کسی قسم کی اصلاحات کا نظام کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے گا۔ بہت سے غیر ضروری محکموں کو بند کرنا پڑے گا اس کے علاوہ حکومتی کنٹرول میں کام کر رہے اداروں میں سے کئی ایک بند بھی کرنے پڑیں گے۔

ان سادہ سے اصولوں کو اپنا کر پاکستان کی پبلک سروس میں بے اندازہ ترقی ہونے کا امکان ہے البتہ کوالٹی کے حصول کے لئے ہمیں بہترین افراد کو نظام میں جگہ دینی ہوگی اور اس سے کم پر سمجھوتہ کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔اس حکایت سے ویسے فرار ممکن بھی نہیں ''لوگوں کو ویسی ہی حکومت ملتی ہے جس طرح کے وہ خود ہوتے ہیں''

(37)

ماہر سیاسیات کے ساتھ ایک مذاکرہ!

معاشیات اور بزنس کے میدانوں کے چیدہ چیدہ لوگوں سے دلچسپ گفتگو کر لینے کے بعد اپنی اس کوشش کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے دوسرے پیشہ ور ماہرین سے بھی بات چیت کرنے کا قصد کیا۔ اب تو یہ کاوش ایک پورے کے پورے ریسرچ پراجیکٹ میں بدلتی جا رہی تھی اگرچہ مجھے پاکستان سے کسی نے اپنے خیالات یا ردعمل سے آگاہ نہیں کیا پھر بھی مجھے امید ہے کہ پاکستان کے قارئین ان مذاکروں کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہونگے اور انہیں فکر انگیز پاتے ہونگے۔ میرے خیال میں جمہوریت اس وقت تک ایک بے معنی سا تصور ہے جب تک کہ اس میں مختلف خیالات اور تصورات کو پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اس مختلف خیالات وتصورات کی آمیزش اور بحث ومباحثہ کی فضا عوام کو آگاہی فراہم کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہوگی مزید برآں ہر مسئلے پر نئی سوچ اور فکر جنم لے گی۔ معاشرے کو زندہ رکھنے کیلئے اور جمہوریت کی مضبوط بنیادیں استوار کرنے کے لئے تمام مسائل پر مسلسل گفتگو کرتے رہنا چاہئے اور اس گفتگو کو میڈیا کے ذریعے عوام تک بھی پہنچنا چاہئے ورنہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اس وجہ سے میں نے کچھ ایسے تارک الوطن پاکستانیوں سے ملنے کا ارادہ کیا جنہوں نے سیاست کے مطالعہ میں امتیاز حاصل کیا ہو ایک مرتبہ پھر ممکنہ غلطی کی معذرت کرتے ہوئے (گفتگو کو آپ تک پہنچانے میں کوتاہی کے امکان کے پیش نظر) میں گفتگو کو مختصراً آپ کے لئے پیش کرتا ہوں۔

س: خواتین وحضرات! آپ سب پاکستانی حالات کا بغور جائزہ لیتے رہتے ہونگے اور ان مشکلات سے بخوبی باخبر ہونگے جو اسے اپنی سیاسی شناخت کو متعین کرنے میں پیش آتی رہیں۔ آیئے ابتداء اس سوال سے کرتے ہیں کہ کیا آپ کے خیال میں ہم جمہوریت کو کامیابی سے اپنے ملک میں متعارف کروانے میں کامیاب ہوگئے ہیں یا نہیں!

ج: جواب کے طور پر بہت واضح اور اونچا ''نہیں'' سننے کو ملا جس کی وجوہات مندرجہ ذیل

ہیں۔

(الف) اگر چہ ہمارے ہاں انتخابات منعقد ہوئے لیکن ان کے نتائج کو قطعاً تسلی بخش قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ جو منتخب نمائندے اسمبلیوں تک پہنچے ہیں وہ وہی پرانے چہرے ہیں جو جمہوریت میں بھی اور مارشل لاء کے دوران بھی عنان اقتدار سے چمٹے رہے ہیں اگر آپ مجلس شوریٰ اور بعد میں ضیاء الحق کے دور کی پارلیمنٹ کے ارکان اور آج کے منتخب نمائندوں کا جائزہ لیں تو آپ وہی چہرے آج پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے دیکھیں گے۔ پاکستان میں جو امراء کی حکومت (oligarchy) قائم ہو گئی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خواہ کوئی سی بھی پارٹی حکومت میں آ جائے خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد حکومت میں ضرور شامل نظر آئے گا۔ نہ تو کوئی نیا خون سامنے آیا نہ ہی نئے نظریات کو موجودہ انتخابات کے نظام کے ذریعے سے آگے آنے کا موقع دیا گیا۔

(ب) ابھی بھی سیاست کا معیار بالکل ویسا ہی ہے جیسا بہت پہلے تھا بلکہ پہلے سے بھی اس کا معیار گر گیا ہے۔ سیاسی جماعتیں امراء کے باہمی اتحادوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جنہیں وہ اپنے آپ کو اقتدار میں رکھنے کے لئے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کسی سیاسی پلیٹ فارم سے مسائل یا نظریات پر کبھی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی اسمبلی میں یا پارٹیوں میں اختلاف نظریاتی یا عقلی بنیادوں پر ہوا ہے۔ قانون ساز اداروں کے اندر اور باہر دونوں کی خرید وفروخت عام ہے۔ وفاداریاں اس وجہ سے نہیں بدلتیں کہ عوام کے مفادات سے متعلق مسائل پر اختلاف ہے بلکہ ذاتی مفادات کے تحفظ کے لئے اس بے غیرتی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ کابینہ میں کسی کو اس لئے شامل نہیں کیا جاتا کہ وہ اس کی اہلیت رکھتا ہے یا وہ اس پوزیشن پر رہتے ہوئے کام کو احسن طریقے سے سرانجام دے سکتا ہے بلکہ یہ پوزیشنیں تو حکومت انعام واکرام کے طور پر اپنے حواریوں کو عنایت کرتی ہے۔ ہمارے سیاستدانوں کو جمہوریت کے اس بنیادی تصور اور نظریئے سے بھی آگاہی حاصل نہیں کہ جس کے لئے وہ منتخب ہوئے ہیں۔ (ملک کو عوام کے لئے ان کے نمائندوں کے طور پر چلایا جانا چاہئے) لیکن سیاستدانوں کا ایک ہی مقصد دکھائی دیتا ہے کہ کیسے ذاتی دولت وشہرت میں اضافہ کیا جائے اور یہ جمہوریت ہرگز نہیں!

(س) آپ کے خیالات ان کے بالکل برعکس ہیں جو کہ پاکستان میں پائے جاتے ہیں جن کے تحت جمہوریت کے لئے صرف انتخابات منعقد کروا دینا ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ ہماری تمام تر تاریخ کے دوران جب بھی میڈیا پر مباحثہ ہوا تو اسی خیال کا اظہار کیا گیا کہ ہمیں صرف اور صرف

الیکشن منعقد کروا دینا چاہئے تا کہ جمہوریت قائم ہو جائے۔ اہل پاکستان کے خیال میں الیکشن ہی مسائل کا آخری حل ہیں! آپ ان سے کن بنیادوں پر اختلاف کرتے ہیں اور آپ کے نزدیک جمہوریت کی کیا تعریف ہے؟ جمہوری رویے کو یقینی بنانے کے لئے آپ کس قسم کے اضافی قوانین تجویز کریں گے؟

ج: 1- کابینہ کو مختصر کرنا:

کابینہ کو آئین کے ذریعے مختصر کرنا چاہئے۔ تجربے سے یہی پتہ چلا ہے کہ حکومت کابینہ میں اضافہ اپنے ووٹوں کی تعداد کو بڑھانے کے لئے کرتی ہے۔ ایک اور وزارت کا اضافہ کرنے سے پہلے پارلیمنٹ میں غور وخوض ہونا چاہئے کیونکہ اس سے ملکی اخراجات میں اضافہ ہوگا جو کہ پاکستان جیسے ملک کے لئے باعث تشویش ہونا چاہئے۔

2- تقرریوں کی پارلیمنٹ سے منظوری:

وزراء ججوں اور اعلیٰ سول افسروں کی تقرری کرتے وقت سینٹ یا پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی کے ذریعے امیدوار کی صلاحیتوں اور اس پوزیشن کے لئے فٹنس کا جائزہ لیا جانا چاہئے اسی طرح یہ اندازہ ہو سکے گا کہ (الف) امیدوار اس پوسٹ کے لئے مناسب اہلیت رکھتا ہے یا نہیں اور ضرورت پڑنے پر نئے خیالات ونظریات تخلیق کر سکتا ہے یا نہیں کہ جن سے عوام کی بھلائی ممکن ہو سکے اور (ب) امیدوار کے اخلاقی کردار کا بھی پتہ چل سکے گا کہ آیا وہ اس ذمہ داری کا اہل ہے یا نہیں کہیں وہ اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل کے لئے اپنے عہدے کو استعمال تو نہیں کرے گا۔

3- سیاسی جماعت کی تعریف:

''سیاسی جماعت'' ایسی اصطلاح ہے کہ جس سے کافی ابہام جنم لیتا ہے اور جس کا بھی جی چاہئے اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا بیٹھا سیاسی جماعت بنالیتا ہے اس لئے سیاسی جماعت کی جامع تعریف کرنی چاہئے تا کہ اس رجحان کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔ ایک سیاسی جماعت کا واضح اور مشتہر پروگرام ہونا چاہئے۔ ایک ایسا نظام بھی قائم کرنا چاہئے جس سے یہ پتہ چلے سکے کہ ایک سیاسی جماعت کی عوام میں کس قدر مقبولیت ہے اور الیکشن میں اسے کتنے ووٹ پڑ سکتے ہیں۔ انتخابات کے وقت ہر سیاسی جماعت کے لئے یہ لازمی کر دینا چاہئے کہ وہ ایک بڑی رقم الیکشن کمیشن

کے ہاں جمع کرائے اور اگر اس جماعت کے ایک مخصوص تعداد میں امیدوار کامیاب نہیں ہو پاتے تو وہ رقم ضبط کر لی جائے۔اس تجویز میں یہ قباحت تو یقیناً ہوگی کہ وہ پارٹی مشکلات کا شکار ہو جائیں گی جو غریبوں یا نچلے طبقے میں زیادہ مقبول ہونگی کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہے ذرائع محدود ہونگے لیکن پھر بھی تجویز کردہ اصلاحات موجودہ نظام سے کہیں بہتر ہیں کیونکہ موجودہ نظام کے تحت تو غریبوں کی شنوائی قطعاً ممکن نہیں۔

یقیناً انتخابات جمہوریت کا ایک اہم جزو ہیں لیکن صرف انتخابات ہی جمہوریت کو لانے کے لئے کافی نہیں۔البتہ یہ جمہوریت کا ایک لازمی رکن ضرور ہے۔صرف الیکشن کے ذریعے سے ذمہ دار حکومت نہیں لائی جاسکتی۔ایک ذمہ دار اور نمائندہ حکومت کے لئے جس کی ملک کو ضرورت ہوتی ہے ایک ایسے فریم ورک کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے آئینی اور قانونی امور سرانجام دیئے جاسکیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ جمہوریت ایک ایسے نظام کا نام ہے کہ جس میں عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں تاکہ وہ ایک واضح قانونی اور آئینی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے ان کے (عوام کے) معاملات چلاسکیں۔یہ ڈھانچہ بہت واضح اور غیر مبہم ہونا چاہئے اور اس میں مسلسل ترقی ہوتی رہنی چاہئے تاکہ نمائندگان کا برتاؤ ذمہ دارانہ ہو سکے اور کسی قسم کے قوانین کو نافذ کرتے ہوئے عوام کی خواہش اور مرضی کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے۔

س: آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ آئینی ڈھانچہ جو ہمارے ہاں موجود ہے وہ جمہوریت کے قیام اور استحکام کے لئے کافی نہیں؟

ج: یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ محض برطانوی نظام کی پیروی کرنا جمہوریت کو اپنے یہاں یقینی بنانے کے لئے کافی نہ ہوگا۔برطانیہ کا پارلیمانی نظام کئی سو سال کے عرصے میں ارتقاء کی بے شمار منازل طے کر کے اپنی موجودہ شکل اختیار کر پایا ہے۔یہ نظام برطانوی روایات سے صد فیصد مطابقت رکھتا ہے انگلستان میں پارٹی سے وفاداری تبدیل کر لینے کو معاشرتی سطح پر بہت ہی برا سمجھا جاتا ہے ایسا کرنے والے کا سیاسی مستقبل ہمیشہ کے لئے تاریک ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ہمارے آئین سازوں نے بغیر اضافی تحفظات فراہم کئے برطانوی نظام کی ہو بہو نقل کر کے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔

ہمیں ایک ایسا نظام تشکیل دینا ہے جس کے ذریعے ایسی حکومت قائم ہو سکے جس میں بہترین لوگ منتخب ہو کر آسکیں جو کام کو صحیح طور پر انجام دینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔مزید برآں

ہمیں یہ بھی یقین کر لینا چاہئے کہ جن لوگوں کو ہم منتخب کریں وہ لوگوں کے مفادات کی مطابقت میں اپنا کام سرانجام دیں۔ہمیں اس طرح کے قوانین بنانے چاہیں جن سے اہل حضرات آگے آ سکیں جو اپنے ووٹروں کی منشا کو اولیت دیں۔تب کہیں جا کر صحیح جمہوریت قائم ہو سکے گی۔

4-امیدواروں اور سیاسی جماعتوں کے بارے میں معلومات:

تمام امیدواروں اور سیاسی جماعتوں کے لئے یہ ضروری ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اثاثوں اور اکاؤنٹس سے عوام کی آگاہی کو ممکن بنائیں۔ان کا ٹیکسوں کے طور پر ادا کیا ہوا روپیہ نیز ان کے براہ راست یا بالواسطہ مالی مفادات کا عوام کو علم ہونا ضروری ہے۔یہ نظام امریکہ میں بھی رائج ہے اور اس کے مثبت نتائج مرتب ہو رہے ہیں۔امیدوار خاص کر کامیاب امیدوار کسی بھی قسم کے کاروباری مفاد سے اپنے آپ کو فاصلے پر رکھتے ہیں۔اس سلسلے میں امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ جیمز بیکر کو بینک کے اپنے شیئر سے ہاتھ دھونے پڑے جو کہ اسے اپنے دادا سے ورثے میں ملا تھا اور اس سے متعلق کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ہمیں اپنے امیدواروں کے لالچ کو قابو میں رکھنے کے لئے بہت سخت قوانین کو لاگو کرنا چاہئے۔

5-عوامی مباحثہ:

میڈیا خاص کر حکومت کے تحت کام کرنے والے اداروں مثلاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ کو پارٹیوں اور امیدواروں کے درمیان ہونے والے مباحث رپورٹ کرنے چاہیں اور انہیں مختلف امیدواروں اور پارٹیوں کے متعلق تجزیاتی رپورٹیں بھی نشر کرنی چاہیں۔اس مقصد کے لئے وہ مختلف پیشہ ور ماہروں کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔اس طرح ملک کو گلی محلوں کی سیاست سے فہم وفراست کی حامل اور مسائل پر سوچ بچار اور غور وفکر سے بھرپور سیاست کی طرف لایا جا سکتا ہے۔

6-جمہوریت کے نگران:

الیکشن کمیشن کو وقتاً فوقتاً نئے رہنما اصول مرتب کرتے رہنا چاہئے اور وفاقی محتسب کی مدد سے وقفے وقفے سے جمہوریت کی پیش رفت کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرنی چاہئے جس میں ایم این اے حضرات اور دیگر سیاستدانوں کے عمومی رویے پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہو۔یہ

رپورٹ ہر پانچ سال بعد عوام کو مہیا کی جانی چاہئے کم تفاصیل کے ساتھ رپورٹیں بمع ہر ایم این اے کی کارکردگی سے متعلق تجزیے کے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے جاری کی جانی چاہیں۔ نجی شعبے کو بھی اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے جمہوری عمل پر اپنے طور پر نظر رکھنی چاہئے۔ وہ ایک سٹینڈنگ کمیٹی قائم کر سکتا ہے جس کے لئے مختلف گروپ پیسہ مہیا کر سکتے ہیں لیکن اس کمیٹی کی آزادی کو یقینی بنانا چاہئے۔ پیسے مہیا کرنے والے گروپ اس پر اپنی اجارہ داری قائم نہ کرنے پائیں۔ پھر یہ کمیٹی ایک آزاد اور خود مختار حیثیت میں جمہوریت کی نگران کا کردار ادا کر سکتی ہے۔